

مقدمہ آبِ حیات

شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد

مقدمۂ آبِ حیات

فہرست

زبانِ اُردو کی تاریخ

اتنی بات ہر شخص جانتا ہے، کہ ہماری اُردو زبان برج بھاشا سے نِکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے۔ لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دُنیا کے پردے پر ہندوستان کے ساتھ آئی ہو۔ اُس کی عمر آٹھ سو برس سے زیادہ نہیں ہے، اور برج کا سبزہ زار اس کا وطن ہے تم خیال کرو گے کہ شاید اِس میراثِ قدیمی کی سند سنسکرت کے پاس ہوگی۔ اور وہ ایسا بیج ہوگا۔ کہ یہیں پھوٹا ہوگا اور یہیں پھلا پھولا ہوگا۔ لیکن نہیں، ابھی سُراغ آگے چلتا ہے۔ سب جانتے ہیں۔ کہ ہندوستان اگرچہ بے ہمتی اور آرام طلبی کے سبب سے بدنام رہا۔ مگر باوجود اس کے مہذب قوموں کی آنکھوں میں ہمیشہ سے کھٹکتا رہا ہے۔ چنانچہ اس کی سرسبزی اور زرخیزی اور اعتدالِ ہوا نے بلائے جان ہو کر ہمیشہ اسے غیر قوموں کی گھڑ دوڑ کا میدان بنائے رکھا ہے۔ پس دانائے فرنگ کہ ہر بات کا پتا پتال تک نکالنے والے ہیں۔ انہوں نے زبانوں اور قدیمی نشانوں سے ثابت کیا ہے۔ کہ یہاں کے اصلی باشندے اور لوگ تھے۔ ایک زبردست قوم نے آکر آہستہ آہستہ کُل ملک پر قبضہ

کرلیا۔ یہ فتح یاب غالباً جیحوں۔ سیحون کے میدانوں سے اُٹھ کر اور ہمارے شمالی پہاڑ اُلٹ کر اس مُلک میں آئے ہوں گے۔ اُس زمانہ کے گیت اور پرانی پُرانی نشانیاں دیکھ کر یہ بھی معلوم کیا ہے کہ وہ لوگ دِل کے بہادر ہمت کے پُورے، صُورت کے وجیہ، رنگ کے گورے ہوں گے۔ اور اس زمانہ کی حیثیت کے بموجب تعلیم یافتہ بھی ہوں گے۔ موقع کا مقام اور سرسبز زمین دیکھ کر یہیں زمین گیر ہوئے۔ اس قوم کا نام آرین تھا اور عجب نہیں کہ اُن کی زبان وُہ ہو جو اپنے اصل سے کچھ کچھ بدل کر اب سنسکرت کہلاتی ہے۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہندوستان میں آکر راجہ مہاراجہ کا خطاب لیا۔ ایران میں تاجِ کیانی پر درفش کاویانی لہرایا اپنے مذہب کا نادر طریقہ لے کر چین کو نگارخانہ بنایا۔ یونان کا طبقہ حکمت سے الگ جمایا۔ رُوما کی عالمگیر سلطنت کی بُنیاد ڈالی۔ اُندلس پہنچ کر چاندی نکالی۔ یورپ سے خبر آئی کہ کہیں، دریا سے مچھلیاں نکالتے نکالتے گوہر سلطنت پائے کہیں پہاڑوں سے دھات کھودتے کھودتے لعلِ بے بہا نکال لائے۔ تب اصلی رہنے والے کون تھے؟ اور اُن کی زبان کیا تھی؟ قیاس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جیسے پنجاب میں اب قطعہ قطعہ کی زبان کہیں کچھ کچھ اور کہیں بالکل اختلاف رکھتی ہے۔ اور یہی حال اور اضلاع ہند میں ہے اسی طرح اس عہد میں بھی اختلاف ہوگا اور اس عہد کی نامی زبانیں وُہ ہوں گی، جن کی نشانی تامل، اُوڑیا، اور تلنگو وغیرہ اضلاع دکھن اور مشرق میں اب تک یادگار موجود ہیں۔ بلکہ اس حالت میں بھی ان کی شاعری

اور انشاء پردازی کہتی ہے، کہ یہ گٹھلی کسی لذیذ میوہ کی ہے۔ اور سنسکرت سے اسے لگاؤ تک نہیں +

فتح یابوں نے ہندوکش کے پہاڑ سے اُتر کر پہلے تو پنجاب ہی میں ڈیرے ڈالے ہوں گے۔ پھر جُوں جُوں بڑھتے گئے ہوں گے، اصلی باشندے کچھ تو لڑتے مرتے دائیں بائیں جنگلوں کی گود اور پہاڑوں کے دامن میں گھُستے گئے ہوں گے۔ کچھ بھاگے ہوں گے، وُہ دکن اور مشرق کو ہٹتے گئے ہوں گے، کچھ فتح یابوں کی غلامی اور خدمت گاری میں کام آتے ہوں گے اور وہی شودر کہلائے ہوں گے۔ چنانچہ اب تک بھی اُن کی صورتیں کہے دیتی ہیں، کہ یہ کسی اور بدن کی ہڈّی ہیں۔

ایران کی تاریخ قدیم میں بھی چار برن موجود ہیں

مدّت دراز تک ایرین بھائیوں کے کاروبار ہندوستانی بھائیوں کے ساتھ ملے جُلے رہے ہوں گے۔ یہی سبب ہے کہ ایران کی تاریخِ قدیم میں مہ آباد اور اُس کے زمانہ کی تقسیم برہما کے زمانے سے، اور اس کے رسوم وقواعد سے مطابقت دکھاتی ہے۔ اور چاروں برنوں کا برابر پتہ لگتا ہے یہاں بُدھ نے انہیں توڑا۔ وہاں زرتشت کے مذہب نے اُسے جلا کر خاک کیا۔ مگر ہندوؤں نے بُدھ کے بعد پھر اپنے حال کو سنبھال لیا۔ ایرانی اپنی بدحالی کو نہ سنبھال سکے۔

چار برنوں کا ہونا فائدہ سے خالی نہیں

چاروں برنوں کی تقسیم اور اُن کا الگ تھلگ رہنا دُور کے دیکھنے والوں کو غرور کے لباس میں نظر آیا۔ مگر حق پوچھو، تو یہ کچھ بُری بات نہ تھی اسی کی برکت ہے کہ آج تک چاروں سلسلے صاف الگ الگ چلے آتے ہیں جو ہندو ہوگا۔ ماں باپ دونوں کی طرف سے خالص ہوگا۔ اور برابر اپنی قوم کا پتا بتا سکے گا۔ جو دوغلا ہوگا، اُس کا سلسلہ الگ، ہو جائے گا۔ اگر یہ قیدیں اس سختی کے ساتھ نہ ہوتیں، تو تمام نسلیں خلط ملط ہو جاتیں۔ نجیب الطرفین آدمی چاہتے تو ڈھونڈھے نہ ملتا۔

زبان کے بھی قانون باندھے گئے

فتح یابوں کی ان سخت قیدوں نے آپس کی بندشوں میں عجیب طرح کے پھندے ڈالے۔ چنانچہ جب نسلوں کی حفاظت کا پورا بندوبست کر چکے۔ تو خیال ہوا کہ شودروں کے ساتھ آٹھ پہر بات چیت، رہنے سہنے اور لین دین کرنے میں بزرگوں کی زبان دوغلی ہو جائے گی۔ اس واسطے کہا کہ ہماری زبان زبانِ الٰہی ہے۔ اور الٰہی عہد سے اسی طرح چلی آئی ہے۔ چنانچہ اُس کے قواعد اور اُصول باندھے۔ اور ایسے جانچ کر باندھے جن میں نقطہ کا فرق نہیں آسکتا۔ اس کی پاکیزگی نے غیر لفظ کو اپنے دامن پر ناپاک دھبّا سمجھا اور سوا برہمن کے دوسرے کی زبان بلکہ

کان تک گزرنا بھی ناجائز ہوا۔ اس سخت قانون نے بڑا فائدہ یہ دیا، کہ زبان ہمیشہ اپنی اصلیت اور بزرگوں کی یادگار کا خالص نمونہ نمایاں کرتی رہے گی۔ برخلاف ایرانی بھائیوں کے اُن کے پاس زبانی سند بھی نہ رہی۔

سنسکرت کی وجہ تسمیہ

اسی بنیاد پر فتح یابوں کی بلند نظری نے اس کا نام سنسکرت[1] رکھا جس کے معنی آراستہ پیراستہ۔ صنعتی، منزّہ، مصفّا، مقدس جو چاہو سمجھ لو۔ ان کے قواعد زبان بھی ایسے مقدس ہوتے، کہ بزرگان دین ہی اُسے پڑھائیں تو پڑھائیں۔ بلکہ اس طرح پکار کر پڑھنا بھی گناہ ہوا۔ کہ شودر کے کان میں آواز پڑے۔ اس زبان کا نام دیوبانی ہوا، یعنی زبانِ الٰہی۔

وید کے سنہ ترتیب

زبان شاہی وید کے سنہ ترتیب جس سے اُس عہد کی زبان کا پتہ لگے ۱۴سو برس قبل سنہ عیسوی خیال کرتے ہیں۔ اس وقت ان فتح یابوں کی باتیں اس ملک اور ملک والوں کے ساتھ ایسی سمجھ لو جیسے ہندوستان میں پہلے پہلے مسلمانوں کی حالتیں۔ اُن کے سنسکرت زبان کے مخرج اور تلفظ، یہاں کے

---

[1] سَن مکمل اور کرت بنائے ہوئے کو کہتے ہیں سنسکرت مہذبوں کی بنائی ہوئی تھی۔ پراکرت کے معنی ہیں، جو طبیعت سے نکلے۔ پس پراکرتیں وہ زبانیں ہیں، جو طبیعت (نیچر) نے اپنی اپنی زمین میں پیدا کر دیں۔

لوگوں میں آکر کچھ اور ہو گئے ہوں۔ اس لئے گھروں اور بازاروں میں باتیں کرنے کو قطعہ قطعہ میں پراکرت زبانیں خود بخود پیدا ہو گئی ہوں گی۔ جیسے اسلام کے بعد اُردو۔ چنانچہ ماگدی (پالی) سورسینی۔ مہاراشٹری، وغیرہ قدیمی پراکرتیں اَب بھی اپنی قدامت کا پتہ بتاتی ہیں۔ اِن کی سیاہی میں سینکڑوں لفظ سنسکرت کے چمکتے نظر آتے ہیں۔ مگر بگڑے ہوئے ہیں دیکھا! پرکت کے معنے ہیں طبیعت، اور جو طبیعت سے نکلے۔ چنانچہ ہیم چند لغات سنسکرت کا جامع بھی یہی کہتا ہے۔ اس کے علاوہ سنسکرت مہذب اور مقدس اور پراکرت غیر مہذب لوگوں کو کہتے ہیں۔ بس ایسی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فہمیدہ لوگ تھے۔ ہر بات کو خوب سمجھتے تھے۔ اور جو کچھ انہوں نے کیا سمجھ کر کیا ہے۔

راجہ بھوج کے عہد کی ناٹک پستکیں کہتی ہیں۔ کہ ان عہدوں میں علمی کتابی اور درباری زبان تو سنسکرت تھی۔ مگر چونکہ معاملہ خاص و عام سے پڑتا ہے۔ اِس لئے گفتگو میں پنڈتوں کو بھی پراکرت ہی بولنی پڑتی تھی پراکرت صاف سنسکرت کی بیٹی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں ہزاروں لفظ سنسکرت کے ہیں، اور ویسے ہی قاعدے صرف و نحو کے بھی ہیں +

سنسکرت کی اتنی حفاظت ہوئی پھر بھی منوسمرتی ویدوں کی ترتیب سے کئی سو برس بعد لکھی گئی تھی۔ اس میں اور وید کی زبان میں صاف فرق ہے اور اب اور بھی زیادہ ہو گیا۔ لیکن چونکہ سلطنت اور معتبر تصانیف پر مذہب کا چوکیدار بیٹھا تھا، اس لئے نقصان کا بہت خطرہ نہ تھا کہ دفعۃً

۴۳ ۵ برس قبل عیسوی میں بدھ مذہب کے بانی شاکی منی پیدا ہوئے وہ مگدھ دیس سے اُٹھے تھے۔ اس لئے وہیں کے پراکرت میں وعظ شروع کیا۔ کیونکہ زیادہ تر کام عوام سے تھا۔ عورت مرد سے لے کر بچے اور بوڑھے تک یہی اُس دیس کی زبان تھی۔ اِن کی آتش زبانی سے مذہبِ مذکور ایسا پھیلنا شروع ہوا، جیسے بن میں آگ لگے، دیکھتے دیکھتے دھرم حکومت، رسم و رواج، دین آئین سب کو جلا کر خاک کر دیا اور مگدھ دیس کی پراکرت کُل دربار اور کل دفتروں کی زبان ہو گئی۔ اقبال کی یاوری نے علوم و فنون میں بھی ایسی ترقی دی، کہ تھوڑے ہی دنوں میں عجیب و غریب کتابیں تصنیف ہو کر اسی زبان میں علوم کے کتب خانے سج گئے۔ اور فنون کے کارخانے جاری ہو گئے۔ کہیں کہیں کونے گوشے میں جہاں کے راجہ وید کو مانتے رہے۔ وہاں ویدوں کا اثر رہا۔

ماگدھی زبان دیوبانی ہو گئی

باقی تاج کے دربار اور علمی سرکاریں سب ماگدھی ہی ماگدھی ہو گئیں۔ ان کے حوصلے وسیع ہو کر دعوے بڑھے اور بآواز بلند کہہ دیا، کہ ابتدائے عالم سے تمام زبانوں کی اصل ماگدھی ہے۔ برہمن اور کل انسان بات کرنے کے لائق بھی نہ تھے۔ اصل میں اُن کی بھی اور قادرِ مطلق بودھ کی زبان یہی ہے اس کی صرف و نحو کی کتابیں بھی تصنیف ہوئیں، خدا کی قدرت دیکھو

جو لونڈی تھی، وہ رانی بن بیٹھی، اور رانی مُنہ چھپا کر کونے میں بیٹھ گئی۔

پھر برہمنوں کا ستارہ چمکا

زمانہ نے اپنی عادت کے بموجب (تخمیناً ۱۵ سو برس بعد) بودھ مذہب کو بھی رخصت کیا۔ اور اس کے ساتھ اس کی زبان بھی رخصت ہوئی شنکراچارج کی برکت سے برہمنوں کا ستارہ ڈوبا ہوا پھر اُبھر کر چمکا۔ اور سنسکرت کی آب وتاب بھی شروع ہوئی۔ راجہ بکرماجیت کے عہد میں جو روشنی اس کی فصاحت نے پائی، آج تک لوگوں کی آنکھوں کا اُجالا ہے اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ دربار سلطنت اور اعلیٰ درجے کے لوگوں کو سنسکرت بولنا اعتبار و افتخار کی سند تھا۔ اور پراکرت عوام کی زبان تھی۔ کیونکہ اس عہد میں جو کالی داس ملک الشعراء نے شکنتلا کا ناٹک لکھا ہے۔ سبھا میں دیکھ لو، بادشاہ، امراء اور پنڈت سنسکرت بول رہے ہیں۔ کوئی عام آدمی کچھ کہتا ہے۔ تو پراکرت میں کہتا ہے۔

گیارھویں صدی عیسوی سے پہلے راجہ بھرتہری کے عہد میں برج کے قطعہ کی وہ زبان تھی، جسے ہم آج کی برج بھاشا کی اصل کہہ سکتے ہیں اس وقت بھی ہر قطعہ میں اپنی اپنی بولی عام لوگوں کی حاجت روائی کرتی تھی۔ اور سنسکرت تصنیفات، اور خواص کی زبانوں کے لئے باعث برکت تھی کہ دفعتہً زمانہ کے شعبدہ باز نے ایک اور رنگ بدلا۔ یعنی اسلام کا قدم ہندوستان میں آیا۔ اس نے پھر مُلک و مذہب کو نیا

انقلاب دیا، اور اُسی وقت سے زبان کا اثر زبان پر دوڑنا شروع ہوا۔

سنسکرت اور اصل فارسی یعنی ژندواستا کی زبان آیرین کے رشتہ سے ایک دادا کی اولاد ہیں۔ مگر زمانہ کے اتفاق دیکھو، کہ خدا جانے کے سو برس یا کے ہزار برس کی بچھڑی ہوئی بہنیں اِس حالت سے آکر ملی ہیں کہ ایک دوسری کی شکل نہیں پہچان سکتی +

ہندوستانی بہن کی کہانی تو سُن چکے۔ اب ایرانی بہن کی داستان بھی سُن لو۔ کہ اس پر وہاں کیا گذری۔ اوّل تو یہی قیاس کرو کہ اس مُلک نے جو ایران نام پایا۔ شاید وُہ لفظ آیرین ہی کی برکت ہو۔ پھر یہ بھی کچھ تھوڑے تعجب کا مقام نہیں کہ جس طرح ہندوستانی بہن پر وقت بوقت بودھ وغیرہ کے حادثے گذرے اسی طرح اس پر بھی وہاں انقلاب پڑتے رہے۔ باوجود اس کے اب تک ہزاروں لفظ فارسی اور سنسکرت کے صاف ملتے جلتے نظر آتے ہیں +

ایرانی بہن جب اس مُلک میں جاکر بسی ہوگی۔ اوّل تو مدت تک اُن کے مذہب، رسم و رواج اور زبان جیسے تھے، ویسے ہی رہے ہوں گے مگر اس زمانہ کی کوئی تصنیف ہاتھ نہیں آئی۔ کچھ ٹوٹا پھوٹا پتا ملتا ہے تو زرتشت کے وقت سے ملتا ہے۔ جسے آج تخمیناً ۲۴ سو برس ہوئے۔ اس نورانی موحّد نے شعلۂ آتش کے پردہ میں توحید کے مسئلہ کو رواج دیا۔ مذہب مذکور نے سلطنت کے بازوؤں سے زور پکڑا۔ اور ایران سے نکل کر دو سو برس ۲۰۰ کے قریب اطراف وجوانب

کو دباتا رہا۔ یہاں تک کہ یونان سے سکندر طوفان کی طرح اُٹھا، اور ایشیا کے امن و امان کو تہ و بالا کر دیا۔ جو مصیبت بودھ کے ہاتھ سے بید شاشتر پر پڑی تھی، وہاں وہی مصیبت ژنداستا پر آئی، چنانچہ جس آگ نے زرتشت اور جاماسپ کے متبرک ہاتھوں سے آتش خانوں کو روشن کیا تھا۔ جس کے آگے گشتاسپ نے تاج اُتار کر رکھا۔ جس کی درگاہ میں اسفندیار نے گرز اور تلوار چڑھائی، وُہ یونان کے آبِ شمشیر سے بجھائی گئی۔ اور آتش خانے راکھ ہو کر اُڑ گئے۔ افسوس یہ ہے کہ ژند و پاژند کے ورق ورق برباد کٹے گئے۔ اور ہزاروں کتابیں فلسفۂ الٰہی اور علوم و فنون کی تھیں کہ نابود ہو گئیں۔ جب کہ یونانیوں نے ملک پر غلبہ پایا، تو زبان نے زبانوں پر بھی زور دکھایا ہوگا۔ تھوڑے ہی دنوں میں پارتھیا والوں کا عمل دخل ہو گیا۔

ایران جسے ہزاروں برس سے ملک گیری کے نشان سلامی اُتارتے تھے اور تہذیب و شائستگی اس کے دربار میں سر جھکاتے تھے پانچ سو برس تک ظفر یابوں کے قبضے میں دبا رہا۔ اور ژند کی کتب مقدسہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر فنا کی گئیں۔

سنہ۲ئہ میں پھر تنِ بے جان میں سانس آیا اور ساسانیوں کی تلواروں میں قدیمی اقبال نے چمک دکھائی۔ ان بادشاہوں نے ملک و مملکت کی قدامت کے ساتھ بجھے ہوئے مذہب کو بھی روشن کیا۔ گرے ہوئے آتش خانوں کو پھر اُٹھایا۔ اور جہاں جہاں سے پھٹے پُرانے اوراقِ پریشان

ہاتھ آئے بہم پہنچائے۔ اُن ہی کی کوششوں کی کمائی تھی۔ جو پھر ساڑھے چار سو برس بعد علمِ اسلام کے سامنے قربان ہوئی۔ اس معاملہ میں ہمیں نیک نیت پارسیوں کا شکریہ نہ بھولنا چاہیئے۔ کیونکہ باوجود تباہی اور خانہ بربادی کے جو پُرانا کاغذ کسی بااعتقاد کے ہاتھ آیا۔ وہ جان کے ساتھ ایمان کو بھی لیتا آیا۔ کہ بندر سورت۔ **گجرات** وغیرہ ملکوں میں آج تک اِسی نورؔ سے آتش خانے روشن ہیں۔ جو کچھ اُن کے پاس ہے۔ وُہ ان تصنیفات کا بقیہ ہے، جو ساسانیوں کے عہد میں ہوئیں۔ کتب مذکورہ دونوں زبانوں کا لفظی اتفاق ہی نہیں ثابت کرتیں بلکہ اُن کے اتحادِ اعتقاد پر بھی شہادت دیتی ہیں۔ جو چار برن ہندوؤں میں ہیں وہی ایران میں تھے۔ اجرام آسمانی کی عظمت واجب تھی۔ حیوانات بے آزار کا مارنا گناہِ عظیم تھا۔ تناسخ کا مسئلہ دونوں میں یکساں تھا۔ آتش۔ آب۔ خاک۔ باد۔ ابر۔ بجلی۔ گرج۔ ہوا وغیرہ وغیرہ اشیاء کے لئے ایک ایک دیوتا مانا ہوا تھا، جس کے اظہارِ عظمت کے لئے خاص خاص طریقے تھے۔

یادِ الٰہی کے زمزمے تھے جن کو وُہ اپنی اصطلاح میں گاتھا کہتے تھے، یہ وہی لفظ ہے۔ جس کے نام پر یہاں گیتا کتاب ہے، کیونکہ اس میں بھی یادِ الٰہی کے گیت ہیں۔ فارسی مروّجہ کے چند الفاظ تمثیلاً لکھتا ہوں، کہ سنسکرت سے ملتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

سنسکرت	فارسی	سنسکرت	فارسی
بھراتّر	برادر	پِتر	پدر
دوہتّر	دختر	پُتر	پور
انگشٹ	انگشت	ماتر	مادر
پاؤں	پا	جانو	زانو
بھئے	بیم	بھار	بار
کُشیا	خاشاک	بھوم	بوم
کھر	خر	اشو	اسپ

ایرانی بہن پر ایران میں پہلے اِسلام کے ہاتھ سے وُہ صدمہ گزرا تھا، جوکہ یہاں دو سو برس کے بعد گذرا۔ اور اس سے اس کی حیثیت بالکل بدل گئی تھی۔ بہرحال یہاں وہ ایسی حالت کے ساتھ پہنچی کہ عربی اور ترکی الفاظ اور بہت سی لفظی اور ترکیبی تبدیلیوں کے سبب سے اس کی صورت نہ پہچانی جاتی تھی۔ یہاں جو مسلمان آئے وہ آپس میں وہی رائج الوقت فارسی بولتے تھے، اور ہندوؤں سے ہندی کے الفاظ مِلا جُلا کر گذارہ کر لیتے تھے۔

اِدھر سنسکرت تو دیوبانی یعنی زبان آسمانی تھی۔ اس میں مَلیچھوں کو دخل کہاں؟ البتہ برج بھاشا نے اِس بن بُلائے مہمان کو جگہ دی۔ دھرم وان ہندو سالہا سال تک ملیچھ بھاشا سمجھ کر غیر زبان سے متنفّر رہے مگر زبان کا قانون دھرم اور حکومت کے قانون سے بھی سخت ہے

کیونکہ اُسے گھڑی گھڑی اور پل پل کی ضرورتیں مدد دیتی ہیں۔ جو کسی طرح بند نہیں ہوتیں۔ غرض آٹھ پہر ایک جگہ کا رہنا سہنا، لین دین کرنا تھا، لفظوں کے بولے بغیر گذارہ نہ کر سکے۔ دو قوموں کے ارتباط میں ایسا اختلاط ضرور ہوتا ہے۔ اور اس کے کئی سبب ہیں۔ (۱) تو یہ کہ اکثر نئی چیزیں ایسی آتی ہیں۔ جو اپنے نام اپنے ساتھ لاتی ہیں (۲) اکثر معانی ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں اُنہی کی زبان میں کہیں تو ایک لفظ میں ادا ہو جاتے ہیں۔ ترجمہ کریں تو ایک فقرہ بنتا ہے۔ پھر بھی نہ وہ مزا آتا ہے اور نہ مطلب کا حق ادا ہوتا ہے۔ اس صورت میں گویا قانون زبان اور آئین بیان مجبور کرتا ہے۔ کہ یہاں وہی لفظ بولنا چاہیئے۔ دوسرا لفظ بولنا جائز نہیں (۳) جو لوگ اکثر غیر ملکوں میں سفر کرتے ہیں، وہ اس لُطف کو جانتے ہیں۔ کہ جب دو غیر زبان والے ایک جگہ رہتے بستے ہیں، تو کبھی کام کاج کی شدّتِ مصروفیت میں، کبھی اس عالم میں ضروری بات جلدی کہہ دینے کی غرض سے۔ کبھی آسانی سے مطلب سمجھانے کو ایک دوسرے کے لفظ خواہ مخواہ اس طرح بول جانے پڑتے ہیں کہ بے اس کے گزارہ نہیں ہوتا (۴) پھر جب ایک جگہ رہ کر شیر و شکر ہوتے ہیں۔ تو اکثر پیار اور محبت سے کبھی آپس کی دل لگی کے لئے ایک دوسرے کے لفظ بول کر جی خوش ہوتا ہے جس طرح دوست کو دوست پیارا ہوتا ہے۔ اسی طرح اس کے لفظ بھی پیارے معلوم ہوتے ہیں یا یوں سمجھو کہ جس طرح وطن دار اپنے مہمانوں کے رہنے کو جگہ دیتے ہیں۔

اسی طرح اُن کی زبان مہمان لفظوں کو جگہ دیتی ہے (۵) بڑی بات یہ ہے، کہ فتح یابوں کے اقبال کی چمک ان کی بات بات کو بلکہ لباس۔ دستار، رفتار، گفتار کو بھی ایسی آب و تاب سے جلوہ دیتی ہے کہ وہی سب کی آنکھوں میں بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ اور لوگ اسے فقط اختیار ہی نہیں کرتے، بلکہ اُس پر فخر بھی کرتے ہیں۔ پھر اس میں بہت سے فوائد بھی عقلی دلائل سے پیدا کرتے ہیں۔

اِسلام نے آتے ہی اختلاطِ الفاظ کی بنیاد ڈال دی تھی

اس زمانہ کی عہد بعہد کی ہندی تصنیفیں آج نہیں ملتیں۔ جن سے وقت بوقت کی تبدیلیوں کا حال معلوم ہو۔ البتہ جب ۱۱۹۳ء میں شہاب الدین غوری نے رائے پتھورا پر فتح پائی، تو چند کوی (ایک نامی شاعر) نے پرتھوی راج راسا لکھا۔ اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ زبان مذکور نے کتنی جلد عربی، فارسی کے اثر کو قبول کر لیا۔ ہر صفحہ میں کئی کئی لفظ نظر آتے ہیں ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُس وقت میں یہاں کی بھاشا بھی کچھ اَور بھاشا تھی۔ میں نمونہ تصنیفِ مذکور کا دکھاتا ہوں:۔

۷۷۔ پتر اُٹھی محل۔ پرتھی راج منگی آردہ نواج۔ ۵۶۔ پتر پرتھر گار[1] پیگامبر[2] دیالاہ کریم کے داد

سرطان[3] جلال دین جایا سرطان[3] شہاب[4] دین[5] نواز ۔ اللہ پایا مسلمان مدیدان لھی مدتی اتنی کہے

کہن لاگے پاتشاہ[6] شیطان پر دُرے دلو ۔ دوں دیوا نچھ اُپاجا دو نویر منڈیا خلک[7] عالم

الولی جیو تے بھوام ولی حضرت خدائے آس اُ مرداں ۔ میل بدھر واسواہ سائیں دے چار راجائی

[1] پروردگار [2] پیغامبر [3] سلطان [4] بیٹا [5] شہاب الدین [6] بادشاہ [7] خلق۔

اتنے ملک کو فرمان: پیش پیش لجلاو لاس کیلاس رو ہشدار شر

۵۲ - پتریا دوالی پرتھی راج با ہندنی مسلمان کری سلام
نہنگ وار پری اُنگلی سُلطان -

یہ اگرچہ مختلف جگہ کے ٹکڑے ہیں، مطلب اُن کا اصل کتاب دیکھنے سے کھلتا ہے۔ مگر حرف شناس آدمی بھی جان سکتا ہے، کہ یہ یہ لفظ عربی، فارسی کے اس میں موجود ہیں۔ محل، پروردگار، پگام (پیغام) کریم سُرطان (یعنے سلطان)، بات شاہ (بادشاہ) دیوان، خلک (خلق) عالم، ہجرت (حضرت) ملک، پھرمان، (فرمان)۔ سلام +

ترجمہ اور تصنیف کے تجربہ کار جانتے ہیں، کہ اُن کی عبارت میں کسی زبان کا اصل لفظ جو اپنا مطلب بتا جاتا ہے۔ سطر سطر بھر عبارت میں ترجمہ کریں، تو بھی وُہ بات حاصل نہیں ہوتی۔ جو مجموعہ خیالات کا اور اس کے صفات دلوازمات، کا اُس ایک لفظ سے سُننے والے کے سامنے آئینہ ہو جاتا ہے، وُہ ہماری سطر بھر سے پُورا نہیں ہوتا۔ مثلاً چند کوی اپنی نظم میں سُلطان کی جگہ اگر راجہ بلکہ مہاراجہ لکھ دیتا، تو بھی جو صفات اور اس کے لوازمات نیک یا بد، رحم یا عدل، زور یا ظلم یہ لفظ اس کی نظم میں دکھا رہا ہے، وہ بات راجہ مہاراجہ سے ممکن نہیں۔ اسی طرح لفظ سلام کہ اس کے مطلب کا حق خواہ ڈنڈوت خواہ پرنام کوئی لفظ ادا نہیں کر سکتا۔ نظیر اس کی آج انگریزی کے سینکڑوں لفظ ہیں۔ اگر ترجمہ کریں، تو سطروں میں بھی مطلب پورا نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایک

ہندوستانی شخص اپنے دوست سے کہتا ہے۔ "لاٹ صاحب چھ بجے سٹیشن پر پہنچیں گے۔ پروگرام کے بموجب شہر کی سیر کریں گے۔ ۵ بجے آنا۔ وہیں چل کر تماشا دیکھیں گے۔ اب خواہ صحیح خواہ بگڑے۔ مگر جو اصلی لفظ اپنے آپ معنے سننے والے کو سمجھا رہے ہیں۔ کئی کئی سطروں میں ترجمہ کئے جائیں تو بھی حقِ مطلب بجا نہ لا سکیں گے۔

کایتھ اوّل نمبر ہیں

آخر پندرہ صدی عیسوی میں کہ سکندر لودھی کا زمانہ تھا۔ اتنا ہُوا کہ اوّل کایتھ فارسی پڑھ کر شاہی دفتر میں داخل ہوئے۔ اور اب ان لفظوں کو اُن کی زبانوں پر آنے کا زیادہ موقع مِلا۔ رفتہ رفتہ اکبر کے عہد سے کہ مسلمان شیر و شکر ہو گئے۔ یہ نوبت ہوئی، کہ اِدھر بادشاہ اور اس کے اعلیٰ درجہ کے اہل دربار نے جبّہ و دستار کے ساتھ داڑھیوں کو خدا حافظ کہا۔ اور جامے پہن کر کھڑکی دار پگڑیاں باندھ بیٹھے۔ اُدھر ہندو شرفا بلکہ راجہ مہاراجہ ایرانی لباس پہننے، اور فارسی بول کر فخر کرنے لگے۔ بلکہ مرزا کے خطاب کو بڑے شوق سے لینے لگے +

امیر خسرو

اَب جس قدر ممکن ہے عہد بعہد کی زبانوں کے نمونے دکھاتا ہوں۔ امیر خسرو جو کہ ۷۲۵ھ ۱۳۲۵ء میں فوت ہُوئے ان کی ایک غزل نظم اُردو کی

تاریخ میں دیکھو۔ جس کا پہلا مصرع ہے۔ ع ۔ زحال مسکیں مکن تغافل دراے نیناں بنائے بتیاں الخ۔ اس سے تمہیں کچھ کچھ حال اس وقت کی زبان کا بھی معلوم ہوگا۔ خالق باری بھی انہیں کے مخلوقات فکر سے ہے۔ باریک بین اشخاص اُس سے بھی بہت سے الفاظ اور فقرے دیکھ کر یہ نکتے سمجھ سکتے ہیں ؎

بیا برادر آؤ رے بھائی　　بنشیں مادر بیٹھ ری مائی

ایک مجرّب نسخہ آنکھوں کا دوہروں کی بحر میں کہتے ہیں :-

لودھ پھٹکری مردہ سنگ　　ہلدی زیرہ ایک ایک ٹنگ
افیون چنا بھر مرچیں چار　　اُردو برابر تھوتھا ڈار
پوست کے پانی پوٹلی کرے　　تُرت پیر نینوں کی ہرے

نظمِ اُردو کی تاریخ میں اِن کی عمدہ پہیلیاں، مکرنیاں، دو سخنے، انمل میں نے لکھ دیئے ہیں۔ انہیں دیکھو اور خیال کرو، کہ بحریں دوہروں کی ہیں مگر فارسیت کس قدر اپنا زور دکھا رہی ہے۔

کبیر

ہندو شاعروں کے دوہرے برج بھاشا میں ہیں، مگر عہد بعہد کی زبان کا پتہ بتاتے ہیں۔ چنانچہ سکندر لودی کے زمانے میں کبیر شاعر بنارس کے رہنے والے علم میں ان پڑھ تھے۔ گرو رامانند کے چیلے ہو کر ایسے ہوئے کہ خود کبیر پنتھوں کا مت نکالا۔ تصنیفات اگر جمع ہوں، تو کئی

جلدیں ہوں۔ اُن کے دوہروں میں فارسی، عربی کے لفظوں کو دیکھو:۔

دین گوایو دُنی سے دُنی نہ آیو ہاتھ
پیر کہاڑی ماریو گا پھل اپنے ہاتھ
کبیر سر پہ سراٹے ہے کیوں سوئے سُکھ چین
کوچ نگارا[2] سانس کا باجت ہے دن رین

گرو نانک صاحب

گرو نانک صاحب کی تصنیفات بہت کچھ ہیں۔ اگرچہ خاص قطعۂ پنجاب کی زبان ہے مگر جس بہتات سے اُن کے کلام میں عربی، فارسی کے لفظ ہیں اتنے کسی کے کلام میں نہیں اور چونکہ ۹۰۰ھ کے بعد فوت ہوئے۔ تو اِس سے چار سو برس پہلے کی پنجابی کا نمونہ بھی معلوم ہو سکتا ہے۔ دوہرا :۔

سائیں مائیں سرب جیو تہارا	تو ہے کھرا پیارا
نانک شاعر ایو کہت ہے	سچے پروردگارا

بلکہ اکثر چیزیں وظیفہ عبادت کے طور پر ہیں۔ اِن میں بھی الفاظ مذکورہ اسی کثرت سے نظر آتے ہیں۔ جپ جی کے دو فقرے دیکھو :۔

(۱) وارن جاؤں اَن ایک بار

(۲) تو سدا سلامت جی نرنکار

---

[1] یعنی غافل۔ [2] نقارہ۔

ملک محمد جائسی کی پدماوت

مسلمان بھی اس زمانہ میں یہاں کی زبان سے محبت رکھتے تھے۔ چنانچہ سولھویں صدی عیسوی شیر شاہی عہد میں ملک محمد جائسی ایک شاعر ہوا، اس نے پدماوت کی داستان نظم کی۔ اس سے عہد مذکور کی زبان ہی نہیں معلوم ہوتی، بلکہ ثابت ہوتا ہے، کہ مسلمان اس ملک میں رہ کر یہاں کی زبان کو کس پیار سے بولنے لگے تھے۔ اس کی بحر بھی ہندی رکھی ہے۔ اور ورق کے ورق اُلٹتے چلے جاؤ فارسی عربی کا لفظ نہیں ملتا۔ مطلب اس کا آج مسلمان بلکہ ہندو بھی نہیں سمجھتا۔ کتاب مذکور چھپ گئی ہے۔ اور ہر جگہ مِل سکتی ہے۔ اس لئے نمونہ نہیں لکھتا:۔

واہ رے طوطے

ہمایوں نے جب گجرات (دکن) پر فوج کشی کی۔ تو سلطان بہادر وہاں کا بادشاہ تھا۔ اور جاپانیر کا قلعہ بڑا مستحکم تھا۔ کہ سلطان خود بھی وہاں رہتا تھا۔ اور تمام خزائن و دفائن وہیں رکھتا تھا۔ محاصرے کے وقت رومی خاں میر آتش (باوجودیکہ کمال معتبر اور صاحب منظورِ نظر سلطان کا تھا) ہمایوں سے مِل گیا۔ اور قلعہ (تمام نفائس اموال، اور خزائن بے حساب سمیت) ہمایوں کے قبضے میں آیا۔ سلطان بہادر کے

پاس ایک طوطا تھا کہ آدمی کی طرح باتیں کرتا تھا اور سمجھ کر بات کا جواب دیتا تھا۔ سلطان اسے ایسا چاہتا تھا۔ کہ سونے کے پنجرے میں رکھا تھا۔ اور ایک دم جُدا نہ کرتا تھا۔ وہ بھی لوٹ میں آیا۔ جب دربار میں لائے۔ رومی خاں بھی موجود تھا۔ طوطے نے دیکھ کر پہچانا اور کہا پھٹ پاپی رومی خاں نمک حرام"۔ سب کو تعجب ہوا۔ اور بیاپیوں نے کہا۔" رومی خاں چہ کنم، کہ جانور است، ورنہ زبانش مے بریدم"۔ اُس نے شرما کر اپنی آنکھیں نیچی کرلیں۔ غرض اس نقل سے یہ ہے۔ کہ اس وقت بھی لوگوں کی زبان پر عربی، فارسی کے لفظ چڑھے ہوئے تھے۔ جب ہی طوطے کی زبان سے نمک حرام کا لفظ نکلا۔ جانور جو سنتا ہوگا۔ وہی بولتا ہوگا۔

بابا تلسی داس اور سور داس

سترھویں صدی عیسوی میں بابا تلسی داس برہمن ضلع باندہ کے رہنے والے کہ پنڈت بھی تھے، شاعر بھی تھے۔ فقیر بھی تھے۔ انہوں نے رامائن کو بھاشا میں اس طرح ترجمہ کیا، کہ وہ لاثانی کتاب مطبوع خاص و عام ہوئی۔ ان کے دوہروں میں بہت اور کتاب مذکور میں کہیں کہیں لفظ فارسی عربی کے موجود ہیں۔ دُہرا رامائن

سنکارے سیوک سکل چلے سوامی رکھ پائے
گھر ترو تر و بن و باگ و بر ڈیرا دیو لگائے

جا غ

گھر بسواس بچن ہٹ بولے	کتنی بھنگ کلہ بھی کھولے
رام انیک گریب نواجے	لوک بید بر ٹوپی و برا جے
گنی گریب گرام نر ناگر	پنڈت موڑے ملیں اوجاگر
بابا کو بابا ملے کرکر لمبے ہاتھ ؟	تلسی داس گریب کی کوئی نہ پوچھے بات

انہی دنوں میں **سورداس جی** نے سری کرشن جی کے ذکر سے اپنے کلام کو مقبول خاص وعام کیا، اِن کی تصنیف میں شاید کوئی شعر ہوگا کہ فارسی عربی لفظ سے خالی ہوگا۔

بابا دھام دھن و نت ا	باندھیوں ہوں اس ساج یعنی ساز
سندت سبھی جانت ہوں	تو نہ آئیو باج یعنی باز نہ آیا
کھیت بہت کا ہے تم تا نے	سبن سنتی آواج یعنی آواز
دیو نہ جات پار اُتر آئے	چاہت چڑھیں جہاج یعنی جہاز
بیچے پار اُتار سور کوں	مہاراج برج راج
تیش کرت کہت پربھو تم سوں	سد گریب نواج غریب نواز

خیال کرو، کہ جب یہ بزرگانِ مذہب اپنے دہروں میں فارسی لفظ بول جاتے تھے۔ تو گفتگو میں عام ہندو لوگ کیا اس سے کچھ زیادہ نہ بولتے ہوں گے۔

بھاشا کا اوجِ اقبال دیکھو

اخیر میں حسن وخوبی برج بھاشا کی راجہ جے سنگھ سوائی کی قدردانی

سے ظاہر ہوئی، انہوں نے ایک ایک اشرفی دہرہ کوی اور گنوان پنڈتوں، کو انعام دے کر دہلی اور نواح دہلی میں شوق پھیلایا

اس عہد میں مسلمانوں کی زبان کا کیا حال ہوگا؟ ظاہر ہے، کہ کئی سو برس سے اسلام آیا ہوا تھا، جن کے باپ، دادا کئی کئی پشت یہیں کی خاک سے اُٹھے اور یہیں پیوند زمین ہوئے۔ انہیں آپس کے رشتوں اور معاملات کے سررشتوں سے ضرور یہاں کی زبان یعنی برج بھاشا بولنی ہوتی ہوگی۔ تازہ ولایت۔ آدھی اپنی آدھی اُن کی ملاکر ٹوٹی پھوٹی بولتے ہوں گے۔ ان زبانوں کی کوئی نثر کی تصنیف نہیں۔ وہی امیر خسرو کی ایک غزل اور پہیلیاں اور مکرنیاں اور بیت پتا بتلاتے ہیں، کہ ۷۰۰ھ میں یہاں کے مسلمان خاصی بھاشا بولتے ہوں گے۔ بلکہ یہی کلام یہ بھی خبر دیتے ہیں۔ کہ مسلمان بھی اب یہیں کی زبان کو اپنی زبان سمجھنے لگے تھے۔ اور اس زبان کو کس شوق اور محبت سے بولتے تھے۔ شاید بہ نسبت ہندوؤں کے فارسی عربی لفظ انکی زبان پر زیادہ آجاتے ہوں گے۔ اور جتنا یہاں رہنا سہنا اور استقلال زیادہ ہوتا گیا، اُتنا ہی روز بروز فارسی ترکی کے لئے ضعف اور یہاں کی زبان نے زور پکڑا ہوگا۔ رفتہ رفتہ شاہجہان کے زمانے ہیں کہ اقبال تیموری کا آفتاب عین اوج پر تھا۔ شہر اور شہر پناہ تعمیر ہوکر نئی دلی دارالخلافہ ہوئی۔ بادشاہ اور ارکان دولت زیادہ تر وہاں رہنے لگے۔ اہلِ سیف، اہلِ قلم، اہلِ حرفہ اور تجار وغیرہ مُلک مُلک اور شہر شہر کے آدمی ایک

جگہ جمع ہوئے، ترکی میں اُردو بازارِ لشکر کو کہتے ہیں۔ اُردوے شاہی اور دربار میں مِلے جلے الفاظ زیادہ بولتے تھے۔ وہاں کی بولی کا نام اُردو ہو گیا۔ اُسے فقط شاہجہان کا اقبال کہنا چاہیئے، کہ یہ زبان خاص و عام میں اِس کے اُردو کی طرف منسوب مشہور ہو گئی۔ ورنہ جو نظم و نثر کی مثالیں بیان ہوئیں اِن سے خیال کو وسعت دے کر کہہ سکتے ہو کہ جس وقت سے مسلمانوں کا قدم ہندوستان میں آیا ہوگا۔ اُسی وقت سے اُن کی زبان نے یہاں کی زبان پر اثر شروع کر دیا ہوگا۔ چند کوی کا کلام مِل گیا۔ اِس میں الفاظ موجود ہیں۔ محمود کے وقت کی نظم یا نثر مِل جائے تو اِس میں بھی ضرور ہوں گے۔

آگاہی ضروری

بیان ہائے مذکورہ سے یہ بھی ثابت ہوا، کہ جو کچھ اِس میں ہوا۔ کسی تحریک یا ارادہ سے نہیں ہوا، بلکہ زبان مذکور کی طبیعت ایسی ملنسار واقع ہوئی ہے۔ کہ ہر زبان سے مِل جل جاتی ہے۔ سنسکرت آئی اُس سے مِل گئی۔ عربی، فارسی آئی اُسے بسم اللہ خیر مقدم کہا۔ اب انگریزی الفاظ کو اس طرح جگہ دے رہی ہے، گویا اُس کے انتظار میں بیٹھی تھی +

اس کو ریختہ کیوں کہتے ہیں؟

اِسی زبان کو ریختہ بھی[1] کہتے ہیں۔ کیونکہ مختلف زبانوں نے اسے

---

[1] پہلے شعراء اُردو کو ریختہ کہتے تھے۔ میر غفر غنی کی تقریر میں دیکھو صفحہ ۳۳ مرزا رفیع فرماتے ہیں۔ ع
شعر جب معنی سے تو بہتر سے کہنا ریختہ

ریختہ کیا ہے، جیسے دیوار کو اینٹ۔ مٹی۔ چونا۔ سفیدی وغیرہ پختہ کرتے ہیں یا یہ کہ ریختہ کے معنے ہیں گری پڑی۔ پریشان چیز۔ چونکہ اس میں الفاظِ پریشان جمع ہیں۔ اس لئے اُسے ریختہ کہتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اس میں عربی، فارسی، ترکی وغیرہ کئی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔ اور اَب انگریزی بھی داخل ہوتی جاتی ہے۔ اور ایک وقت ہوگا۔ کہ عربی، فارسی کی طرح انگریزی زبان قابض ہو جائے گی۔

ایک نواب زادے کی گفتگو

مَیں ایک نواب زادے کی گفتگو لکھتا ہوں۔ جس کی پرورش اور تعلیم گھریلو ہے۔ یعنی نہ عربی، فارسی کی لفاظی نے اس پر رنگ چڑھایا ہے نہ انگریزی نے روغن پھیرا ہے۔ فقط دوستانہ بے تکلفانہ باتیں ہیں:۔
"بڑے آغا کی پنشن لینے کل کچہری گیا تھا۔ ڈپٹی صاحب کے کمرے کے آگے کچھ قرقی کا مال نیلام ہو رہا تھا۔ کمریاں کوٹ اور واسکٹیں نئی تھیں۔ کنٹر اور گلاس بھی ولایتی تھے، کرسیاں، میزیں، چقیں بانکے خوش رنگ تھیں۔ میں نے کہا چلو کوئی ڈھب کی چیز ہو تو لے لیں منجھلے آغا بولے، جانے بھی دو۔ جس مال نے مالک سے وفا نہ کی، ہم سے کیا وفا کرے گا۔ آتے ہوئے ریل اسٹیشن کے پاس دیکھتا ہوں، کھبےّ مرزا جان چلے آتے ہیں۔ شکرم ٹھیرا کر بڑے تپاک سے ملے بڑھاپے نے بچارے کا رنگ روپ سب کھو دیا وہ شکل ہی نہیں

وہ صورت ہی نہیں۔ کیسے گورے چٹے سجیلے جوان تھے۔ لوگ تصویریں اترواتے تھے۔ میں نے کہا۔ میاں! ہم نے تو جانا تھا۔ تم دکھن سے خوب چاق، چوبند، سُرخ سفید ہو کر آؤ گے۔ تم تو سُوکھ کر قاق ہو گئے۔ غضب کیا اگلا جوبن بھی گنوا آئے۔ ٹھنڈا سانس بھر کر بولے ہائے جوانی +

فارسی عربی کے الفاظ تو ظاہر ہیں۔ مگر خیال کیجئے۔ کہ قُرق، چَق، چاق قاق آکا ترکی ہیں۔ میز[1] نامعلوم، نیلام پرتگالی ہے۔ کمرا، اطالی ہے ڈپٹی۔ ریل، اسٹیشن، کوٹ۔ واسکٹ، کنٹر۔ گلاس۔ انگریزی ہیں چٹا۔ کھبّا پنجابی ہے۔ مگر اتنا ہے کہ ہم چٹا بغیر گورے کے اور اسی طرح چنگا بغیر بھلے کے نہیں بولتے۔ وہ اکیلا ہی بولتے ہیں۔ کھبّا پنجابی میں عام ہے۔ خاص صفت کے ساتھ بولتے ہیں۔

بھانڈا پھوڑنا۔ اُردو میں کسی بات یا راز کھول دینے کو کہتے ہیں پنجابی میں باسن کو بھانڈا ہی کہتے ہیں۔ گلا گھونٹنا اُردو میں بولتے ہیں۔ پنجابی میں کھینچ کر باندھنے کو یا مضبوط پکڑنے کو کہتے ہیں۔ مثلاً گھُٹ کر باندھو یا گھُٹ کر پکڑو۔ بھُنّا۔ بھُنانا توڑنا اور تڑوانا ہے۔ اور اسی سبب سے پنجابی میں روپیہ کے لئے بھی بھنانا کہتے ہیں۔ اُردو میں پہلے معنے متروک ہو گئے۔ دوسرے معنے رہے وُہ بھی زبر کو پیش کر کے کہ

---

[1] میز دری زبان میں ترجمہ ٹیبل کا ہے۔ مگر اُردو کو یہ فارسی مروّجہ سے نہیں ملا۔ صاحب لوگوں سے پہنچا ہے۔

جاؤ روپے کے ٹکے بھنا لاؤ۔ اور اس اصلیت کا سُراغ یوں لگا۔ کہ فارسی میں روپے کے لئے خوردہ کردن بولتے ہیں۔ اور اُردو میں بھی کہتے ہیں۔ صبح کو روپیہ خوردہ کیا تھا۔ دوپہر کو دیکھو تو برکت! یعنی سب پیسے اُٹھ گئے۔

کسوٹی۔ گھسنا مرادف فرسودن اُردو میں بالکسر ہے۔ پنجابی میں اس طرح بولتے ہیں کہ کاف مفتوح معلوم ہوتا ہے۔ اور ٹا کا تلفظ عجیب ہے۔ کہ ان ہی کے لہجہ کے لئے خاص ہے۔ بہرحال اس سے کس وَٹی (گھسنے کی بٹیا) معیار کا نام ہوا۔ اُردو میں یہی لفظ کسوٹی ہو گیا۔

روپ۔ سجیلا۔ جوبن۔ گنوایا۔ برج بھاشا ہے۔ ان کے علاوہ روزمرّہ کی باتوں پر خیال کرو۔ یُوسف، ہارون، مُوسیٰ۔ عیسیٰ وغیرہ، عبرانی ہیں۔ کیمیا۔ فیلسُوف اصطرلاب یُونانی ہیں۔ اُرد یعنی ماش تامل ہے۔ نِنھا یعنی خورد گجراتی ہے۔ بڑا جو کڑاہی میں تلتے ہو تلنگو ہے۔ گدام ملایا کی زبان ہے۔ تمباکو امریکہ کا لفظ ہے۔ یورپ کے رستہ ہوکر اکبر کے عہد میں یہاں پہنچا +

اُردو میں اُس وقت نثر کی کوئی کتاب نہ لکھی گئی۔ جس سے سِلسلہ ان تبدیلیوں کا معلوم ہو۔ میر جعفر زٹلؔ کے کلام میں سے محمّد شاہی بلکہ اس سے پہلے زمانہ کا نمونہ لکھتا۔ مگر زٹلیؔ کا اعتبار کیا؟

فضلی مرحوم کی وہ مجلس کی عبارت

البتہ محمد شاہ کے عہد میں ۱۱۴۵ھ میں فضلی تخلّص ایک بزرگ نے وہ مجلس لکھی - اس کے دیباچہ میں سببِ تالیف لکھتے ہیں - اور غالباً یہی نثر اُردو کی پہلی تصنیف ہے۔ "پھر دل میں گزرا کہ ایسے کام کو عقل چاہیئے کامل اور مدد کسو طرف کی ہوئے شامل کیونکہ بے تائید صمدی اور بے مددِ جنابِ احمدی۔ یہ مشکل صورت پذیر نہ ہووے اور گوہرِ مراد رشتۂ اُمید میں نہ آوے - لہذا کوئی اِس صنعت کا نہیں ہوا مخترع اور اب تک ترجمہ فارسی بعبارت ہندی نثر نہیں ہوا مُستمع - پس اس اندیشۂ عمیق میں غوطا کھایا اور بیابان تأمّل و تدبیر میں سرگشتہ ہوا لیکن راہ مقصود کی نہ پائی۔ ناگاہ نسیم عنایتِ الٰہی دلِ افگار پہ اہتزاز میں آ - یہ بات آئینہ خاطر میں مُنہ دکھلائی"۔

شعلۂ عشق نثر میں بھی تھی

میرؔ کی مثنوی شعلۂ عشق کے مضمون کو بھی مرزا رفیع نے نثر میں لکھا ہے - افسوس کہ اس وقت موجود نہیں - اس کا انداز بالکل یہی ہے - کہ چند فقرے سوداؔ کے ایک دیباچہ سے نقل کرتا ہوں جو کلیات میں موجود ہیں :-

نثر ملیوز ار فیع۔ ضمیر منیر پہ آئینہ داران معنی کے مبرہن ہو کہ محض عنایت حق تعالیٰ کی ہے۔ جو طوطیِ ناطقہ شیریں سخن ہو۔ پس یہ چند مصرع کہ از قبیل ریختہ، در ریختہ۔ خامۂ دو زبان اپنی سے صفحۂ کاغذ پر تحریر پائے لازم ہے۔ کہ تحویل سخن سامعہ سنجانِ روزگار کروں تا زبانی اِن اشخاص کی ہمیشہ موردِ تحسین و آفرین رہوں ؎

قیمتِ قدر شناسا ہی سے پہنچے ہے بہم

ورنہ دُنیا میں خذف بھی نہیں گوہر سے کم

مضمون حسینہ ہیں بیش از مُرغ اسیر نہیں۔ کہ ہو بیچ قفس کے، جس وقت زبان پر آیا۔ فریاد بُلبل ہے واسطے گوشِ دادرس کے غرض جس اہل سخن کا درِ منصفی زینتِ لب ہے۔ سررشتۂ حسن معانی کا اِس کلام کے اس سے انصاف طلب ہے۔ اگر حق تعالیٰ نے صبح کاغذ سفید کی مانند تمام سیاہ کرنے کو یہ خاکسار خلق کیا ہے تو ہر انسان کے فانوسِ دماغ میں چراغِ ہوش دیا ہے، چاہیئے، کہ دیکھ کر نکتہ چینی کرے۔ ورنہ گزندِ زہر آلود سے بے اجل کاٹے کو مرے" +

اِس تصنیف سے تخمیناً ۳۰ برس کے بعد جبکہ میر انشاء اللہ خان اور مرزا جان جاناں مظہر کی دِلّی میں ملاقات ہوئی ہے۔ اس گفتگو کے چند فقرے بھی قابلِ غور ہیں۔ سید اِنشاء مرزا جان جاناں سے فرماتے ہیں :۔

سیّد انشاء کی تقریر

ابتدائے سنِ صبا سے تا اوائلِ ریحان۔ اور اوائلِ ریعان سے الی الآن اشتیاق ما لا یطاق تقبیل عتبہ عالیہ زبجدے تھا۔ کہ سلک تحریر و تقریر میں منتظم ہوسکے۔ لہذا بے واسطہ و وسیلہ حاضر ہُوا ہوں۔

مرزا جانجاناں کا جواب

مرزا صاحب جواب میں فرماتے ہیں۔ اپنے تئیں کوں بھی بدو طفلی سے تمہیں ایسے اشخاص کے ساتھ موانست اور مجالست رہی ہے لیکن میر غفر غلیہ کے نام سے ایک گفتگو سید انشاء نے دریائے لطافت میں لکھی ہے۔ اسے پڑھ کر تعجب آتا ہے۔ کہ اس صاحبِ کمال نے یہ زبان کس فصاحت کے قالب میں ڈھالی تھی۔ کہ اِن عبارتوں میں اور اُس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ شاید مرزا جانِ جاناں اور سودا وغیرہ بزرگوں کی تحریر کچھ اور ہوگی۔ تقریر کا انداز اور ہوگا۔

بہرحال اس وقت تک انشاپردازی اور ترقی اور وسعت زبان اُردو کی فقط شعرا کی زبان پر تھی۔ جن کی تصنیفات غزلیں عاشقانہ اور قصیدے مدحیہ ہوتے تھے۔ اور غرض ان سے فقط اتنی تھی کہ

امرا و اہلِ دول سے انعام لے کر گزارا کریں۔ یا تاریخ طبع یا یہ کہ ہم
چشموں میں تحسین و آفرین کا فخر حاصل کریں۔ وہ بھی فقط نظم میں۔
نثر کے حال پر کسی کو اصلا توجہ نہ تھی۔ کیونکہ کارروائی مطالبِ ضروری
کی سب فارسی میں ہوتی تھی۔ مگر خدا کی قدرت دیکھو۔ تھوڑے عرصے
میں کئی قدرتی سامان جمع ہو گئے۔ اور سب سے مقدم سبب اس کی
عام فہمی تھی۔ کہ ہر شخص سمجھتا تھا۔ اس لئے لکھنے والوں کو اسی میں واہ وا
لینے کا شوق ہوا۔ میر محمد حسین خان تحسین نے چار درویش کا قصہ
اردو میں لکھ کر نو طرزِ مرصع نام رکھا۔ شجاع الدولہ کے عہد میں
تصنیف شروع ہوئی ۱۰۹۷ء ۱۳۱۳ھ نواب آصف الدولہ کے عہد
میں ختم ہوئی۔

ادھر تو یہ چونچال لڑکا شعراء کے جلسوں اور امرا کے درباروں
میں اپنے بچپنے کی شوخیوں میں سب کے دل بہلا رہا تھا۔ ادھر دانائے
فرنگ کلکتہ میں فورٹ ولیم کے قلعہ پر دوربین لگائے بیٹھا تھا۔ اس
نے دیکھا۔ نظر باز تاڑ گیا۔ کہ لڑکا ہونہار ہے۔ مگر تربیت چاہتا ہے
تجویز ہوئی کہ جس ملک پر حکمرانی کرتے ہیں۔ اس کی زبان سیکھنی
واجب ہے۔ چنانچہ ۱۷۹۹ء ۱۲۱۴ھ میں میر شیر علی افسوس نے باغِ اردو
اور ۱۸۰۵ء ۱۲۲۰ھ میں "آرائشِ محفل" لکھی۔ میر امن دہلوی نے ۱۸۰۲ء ۱۲۱۷ھ
میں باغ و بہار آراستہ کیا۔ اور انہی دنوں میں اخلاقِ محسنی کا ترجمہ لکھا
ساتھ ہی جان گلگرسٹ صاحب نے انگریزی میں قواعد اردو لکھی۔

۱۸۰۲ء ۱۲۱۷ھ میں شری للوجی لال کوی نے پریم ساگر[1] لکھی۔ اور بیتال پچیسی[2] جو محمد شاہ کے زمانہ میں سنسکرت سے برج بھاشا میں آئی تھی۔ اب عام فہم اُردو ہو کر ناگری میں لکھی گئی۔ لیکن اس نقارۂ فخر کی آواز کو کوئی دبا نہیں سکتا کہ میر انشاء اللہ خاں پہلے شخص ہیں جنھوں نے ۱۸۰۷ء ۱۲۲۲ھ میں قواعد اُردو لکھ کر ایجاد کی ٹہنی میں ظرافت کے پھول کھلائے

مذہبی تصانیف اُردو میں

عجیب لطف یہ ہے۔ کہ زبان اُردو کی عام فہمی دیکھ کر مذہب نے بھی اپنی برکت کا ہاتھ اس کے سر پر رکھا۔ یعنی ۱۸۰۸ء ۱۲۲۳ھ میں مولوی شاہ عبدالقادر صاحب نے قرآن شریف کا ترجمہ اُردو میں کیا۔ بعد اس کے مولوی اسمٰعیل صاحب نے بعض رسالے عام اہل اسلام کی فہمائش کے لئے اُردو میں لکھے۔

اُردو اخبار

۱۸۳۵ء سے دفاتر سرکاری بھی اُردو ہونے شروع ہوئے چند سال کے بعد کل دفتروں میں اُردو زبان ہو گئی۔ اِسی سنہ میں اخباروں کو آزادی حاصل ہوئی۔ ۱۸۳۶ء میں اُردو کا اخبار دلی میں جاری ہوا۔ اور یہ اِس زبان میں پہلا اخبار تھا کہ میرے والد مرحوم[3]

[1] پریم ساگر سمت ۱۸۶۰ میں بھاشا ہوئی [2] بیتال پچیسی ۱۸۰۰ء میں مظہر علی ولا نے اُردو میں لکھی [3] مولانا باقر صاحب جو غدر دہلی میں بہ الزام بغاوت شہید کئے گئے

کے قلم سے نکلا۔

دفاتر سرکاری اُردو ہوئے

غرض اپنی آسانی کے وصف سے اور اس لحاظ سے کہ ملکی زبان یہی ہے۔ دفتری زبان بھی یہی ٹھیری۔ اُردو نے آہستہ آہستہ فارسی کو پیچھے ہٹانا اور اپنا قدم آگے بڑھانا شروع کیا۔ تب سرکار نے مناسب سمجھا۔ کہ اس ملک کے لوگوں کو ان ہی کی زبان میں انگریزی علوم و فنون سکھائے جائیں۔ چنانچہ ۱۸۴۲ء سے دلّی میں سوسائٹی قائم ہو کر ترجمے ہونے لگے۔ اور ضرورتِ علمی الفاظ بہم پہنچانے لگی۔ خیال کرو۔ جس زبان کی فقط اتنی بنیاد ہو، وہ زبان کیا اور اس کی وسعت کا میدان کیا۔ البتّہ اب اُمید کر سکتے ہیں کہ شاید یہ بھی ایک دن علمی زبانوں کے سلسلہ میں کوئی درجہ پائے۔

اُردو روز نیا رنگ بدلتی ہے

اُردو اس قدر جلد جلد رنگ بدل رہی ہے۔ کہ ایک مصنّف اگر خود اپنی ایک سنہ کی تصنیف کو دوسرے سنہ کی تصنیف سے مقابلہ کرے۔ تو زبان میں فرق پائے گا۔ باوجود اس کے اب تک بھی اس قابل نہیں کہ ہر قسم کے مضمون خاطر خواہ ادا کر سکے۔ یا ہر علم کی کتاب کو بے تکلّف ترجمہ کر دے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اکثر علوم اور ہزاروں مسائل

علمی ممالکِ فرنگ میں ایسے نکلے ہیں۔ کہ زمانۂ سلف میں بالکل نہ تھے۔ اس واسطے عربی، فارسی، سنسکرت بھاشا وغیرہ جو کہ اردو کے بزرگ ہیں، اُن کے خزانہ میں بھی اس کے ادائے مطلب کے لئے لفظ نہیں۔ اور اِس میں ہم اُردو بچاری کے افلاس پر چنداں تعجّب نہیں کر سکتے۔ خصوصاً جب کہ ہندو۔ مسلمان اپنے اپنے بزرگوں کی میراث کو بھی ہاتھ سے کھوئے بیٹھے ہوں *

بِرج بھاشا پر عربی اور فارسی زبانوں نے کیا کیا اثر کئے

جب دو صاحبِ زبان قومیں باہم ملتی ہیں تو ایک کے رنگ رُوپ کا دوسرے پر ضرور سایہ پڑتا ہے۔ اگرچہ اس کے اثر۔ گفتگو۔ لباس۔ خوراک۔ نشست و برخاست مختلف رُسوم میں بھی ہوتے ہیں لیکن چونکہ مجھے اس مقام پر زبان سے غرض ہے۔ اِس لئے اسی میں گفتگو کرتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ جب ایک زبان دوسری قوم میں آتی ہے تو اپنے ملک کی صدہا چیزیں ایسی لاتی ہے۔ کہ جو یہاں نہیں تھیں۔ اشیائے مذکورہ کبھی ضروری اور کبھی ایسی باعثِ آرام ہوتی ہیں۔ کہ انھیں استعمال میں لینا ضروریاتِ زندگی سے نظر آتا ہے۔ اس لئے یہ لوگ اِنہیں غنیمت سمجھ کر لیتے ہیں۔ اور بخوشی کام میں لاتے ہیں۔ ان اشیائے

میں سے بہتیری چیزیں تو نام اپنے ساتھ لاتی ہیں۔ اور بہتیری نئی ترکیب سے۔ یا اول بدل کر یہاں نیا نام پاتی ہیں۔ اور یہ پہلا اثر دوسری زبان کا ہے۔ اس کے علاوہ جب یہ دونوں ایک جگہ رہ سہہ کر شیر و شکر ہوتی ہیں۔ تو ایک زبان میں دوسری زبان کے تلفظ بھی گھل مل جاتے ہیں۔

جب مہمان و میزبان ایک دوسرے کی زبان سمجھنے لگتے ہیں۔ تو ایک خوش نما اور مفید تبدیلی کے لئے رستہ پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ اگرچہ طبع انسانی کے اتحاد سے سب کے خیالات متفق یا قریب قریب ہوں، مگر اندازِ بیان سب کا جُدا جُدا ہے۔ اور طبیعت ہمیشہ نئے اندازِ کو پسند کرتی ہے۔ اس لئے ادائے مطلب میں ایک دوسرے کے اندازِ بیان سے بھی فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ پھر نئی نئی تشبیہیں۔ لطیف استعارے لے کر اپنی پرانی تشبیہوں اور مستعمل استعاروں کا رنگ بدلتے ہیں۔ اور جس قدر زبان میں طاقت ہے ایک دوسرے کے خیالات اور نئی طرز کو لے کر اپنی زبان میں نیا مزہ پیدا کرتے ہیں +

یہ انقلاب حقیقت میں وقت بوقت ہر ایک زبان پر گذرتا ہی چنانچہ قوم عرب جو ایک زمانہ میں رُوم، یونان اور ہسپانیہ وغیرہ سے غلط ملط ہوئی تھی ہزاروں لفظ علمی اور غیر علمی وہاں سے لئے۔ اسی طرح فارسی زبان عربی و ترکی وغیرہ الفاظ سے مالا مال نظر آتی

ہے۔ انگریزی کے باب میں مجھے کچھ کہنا زیبا نہیں۔ کیونکہ اب روشن ضمیر انگریزی خواں بہت ہیں۔ اور مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ مگر اتنا کہنا کافی ہے۔ کہ جس طرح ایک مہذب سلطنت کو تمام ضروریات سلطنت کے کارخانے اور ملکی سامان موجود ہونے چاہئیں، اسی طرح سب قسم کے الفاظ اور تمام ادائے خیالات کے انداز انگریزی زبان میں موجود ہیں۔

اب مجھے اپنی زبان میں گفتگو کرنی چاہیئے۔ لیکن اتنا پھر یاد دلانا واجب ہے۔ کہ اُردو کہاں سے نکلی ہے۔ اور کیونکر نکلی ہے؟ اُردو زبان اوّل لین دین۔ نشست، برخاست کی ضرورتوں کے لئے پیدا ہوگئی۔ ہندوؤں کے ساتھ ہندی مسلمان جو اکثر ایرانیوں یا ترکستانیوں کی اولاد تھے۔ ہندوستان کو وطن اور اس زبان کو اپنی زبان سمجھنے لگے۔ یہ بھی ظاہر ہے۔ کہ جس طرح زمین بے روئیدگی کے نہیں رہ سکتی۔ اِسی طرح کوئی زبان بے شاعری کے نہیں رہ سکتی۔

اُردو کی ابتدائی تصنیفیں نظم سے شروع ہوئیں

محمد شاہی دور تھا اور عیش وعشرت کی بہار تھی۔ اِن شرفا کو خیال آیا ہوگا۔ کہ جس طرح ہمارے بزرگ اپنی فارسی کی انشاء پردازی میں گلزار کھلاتے تھے۔ اَب ہماری یہی زبان ہے ہم بھی اس میں کچھ رنگ

دکھائیں۔ چنانچہ وہی فارس کے خاکے اُردو پر اُتار کر غزل خوانیاں شروع کر دیں۔ اور قصیدے کہنے لگے۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ جو کچھ قوتِ بیان، یا لفظوں کی تراشی، یا ترکیبوں کی خوبصورتی یا تشبیہ اور استعاروں کی رنگینی۔ غرض اوّل جو کچھ نصیب ہوا شعراء اُردو کی بدولت ہُوا۔ اور یہی سبب ہے کہ جو کچھ سامان ایک ملکی اور ٹکسالی زبان کے لئے درکار ہوتے ہیں۔ اُس سے یہ زبان مفلس رہی کیونکہ اس عہد میں علوم و فنون، تاریخ، فلسفہ، ریاضی، وغیرہ کا چرچا عام ہوتا تو اس کیلئے بھی الفاظ ہو جاتے جن جن باتوں کا چرچا تھا۔۔۔

انہی سامانوں کے الفاظ اور خیالات پیدا ہوئے، ہاں یہ کہنا ضرور چاہیئے کہ جو کچھ ہُوا تھا اپنے رنگ پر خوب ہُوا تھا +

اب ہمیں پھر مطلب پر آنا چاہیئے۔ کہ بھاشا نے اُردو کے کپڑے پہننے کے لئے فارسی سے کیا کیا لیا +

بہت چیزیں ہند میں آئیں اور اپنے نام اپنے ساتھ لائیں

۱۔ اُن چیزوں کے نام لئے جو عرب اور فارس سے آئیں اور اپنے نام اپنے ساتھ لائیں۔ مثلاً لباس میں فرغل، لبادہ، کرتہ، قبا، چوغا، آستین، گریباں، پائجامہ، ازار، عمامہ، رومال، شال، دوشالہ، تکیہ، گاؤ تکیہ، برقع، پوستین وغیرہ

کھانے کے ذیل میں:۔ دسترخوان، چپاتی، شیرمال، باقرخانی

پلاؤ۔ زردہ۔ مزعفر۔ قلیہ۔ قورمہ، متنجن، فرنی، ماقوتی، حریرہ، حلیسہ لوز، مربّے۔ اچار، فالودہ، گلاب، بید مشک، خوان، طبق، رکابی تشتری، کفگیر، چمچہ، سینی، کشتی، چائے، جوش وغیرہ :۔

متفرقات ہیں :۔ حمام۔ کیسہ۔ صابون۔ شیشہ۔ شمع، شمعدان، فانوس۔ گلگیر۔ تنور۔ رفیدہ۔ مشک، نماز، روزہ، عید، شب برات، قاضی، ساقی، حقہ، نیچہ، چلم، تفنگ، بندوق، تختۂ نرد، گنجفہ، اور ان کی اصطلاحیں۔ یہ سب چیزیں اپنے نام ساتھ لے کر آئیں۔ بہت سی چیزیں آئیں کہ بھاشا میں ان کے لئے نام نہیں۔ سنسکرت کی کتابوں میں ہوں گے، پستہ، بادام، منقےٰ، شہتوت، بیدانہ، خوبانی، انجیر، سیب، بہی، ناشپاتی، انار وغیرہ

بہت چیزیں ہندی کی ہیں مگر اپنے ہندی نام کھو بیٹھی ہیں

۲۔ بہت سے عربی فارسی کے لفظ کثرتِ استعمال سے اس طرح جگہ پکڑ بیٹھے ہیں۔ کہ اب ان کی جگہ کوئی سنسکرت یا قدیمی بھاشا کا لفظ ڈھونڈ کر لانا پڑتا ہے۔ مگر اس میں یا تو مطلب اصلی فوت ہو جاتا ہے۔ یا زبان ایسی مشکل ہو جاتی ہے۔ کہ عوام تو کیا خواص ہنود کی سمجھ میں بھی نہیں آتی۔ مثلاً، دلاّل۔ فراش۔ مزدور۔ وکیل جلاّد، صرّاف، مسخرا، نصیحت، لحاف، توشک، چادر، صورت، شکل، چہرہ، طبیعت، مزاج، برف، فاختہ، قمری،

کبوتر، بلبل، طوطا، پر، دوات، قلم، سیاہی، جلّاب، رقعہ عینک، صندوق، کرسی، تخت، لگام، رکاب، زین، اتنگ پوزی، نعل، کوتل، عقیدہ، وفا، جہاز، مستول، بادبان، تہمت درہ، پردہ، دالان، تہ خانہ، تنخواہ، ملاّح، تازہ، غلط، صحیح رسد۔ سرباری، کاریگر، ترازو، شطرنج کے باب میں تعجب ہے۔ کہ خاص ہند کا ایجاد ہے۔ مگر عرب اور فارس سے جو پھر کر آئی تو سب اجزاء کے نام اور اپنی اصطلاحیں بدل آئی۔

سینکڑوں لفظ عربی فارسی لکھے یہاں آئے۔ مگر ہوا موافق نہ آئی، اس لئے مزاج اور صورت بگڑ گئی۔ مثلاً مُرغا وغیرہ دیکھو صفحہ ۵۱

صَرف میں فارسی نے ہندی پر کیا اثر کیا

صَرف میں فارسی سے کچھ نہیں لیا، تو وا تنا کیا، کہ وَان علامت جمع ہندی کو عربی فارسی لفظوں پر بھی لگا لیا۔ مثلاً آدمیوں، انسانوں درختوں، میووں۔

اسم فاعل۔ فارسی عربی کے بلے شمار لئے۔ اور ان میں شطرنج باز کے قیاس پر چوپڑ باز اور وفادار کے قیاس پر ظرفا سمجھ دار۔ سمجھ ناک بھی بول دیتے تھے۔ باغبان کے قیاس پر گاڑی بان، ہاتھی بان، بہلبان، گربان اور دان حقیقت میں ایک ہیں۔ کیونکہ اصل

ہیں دونوں زبانیں ایک دادا کی اولاد ہیں۔ اس کی تحقیق جیسی کہ چاہئیے
فارسی لکچروں[۱] میں لکھی ہے۔

اسم ظرف۔ قلمدان وغیرہ کے قیاس پر خاصدان۔ پاندان
ناگردان۔ پیک دان۔ مودیخانہ۔ پیخانہ +

باب الحروف

باب الحروف کا بھی یہی حال ہے۔ مثلاً حروف تشبیہ کوئی
نہیں لیا۔ مگر چنانچہ اور چونکہ موجود ہیں۔ اور اسی طرح آتے ہیں کہ ترجمہ
کے لئے ہندی حروف معلوم ہی نہیں ہوتے +

حرف شرط ہیں۔ اگر اور اس سے اگرچہ بھی لیا +

واؤ عاطفہ۔ بمعیت معطوف اور معطوف علیہ۔ اُردو عبارت
میں لے لئے۔ مثلاً آب و ہوا، شب و روز، صبح و شام زور و شور

حرف استثنا میں سے مگر اور عربی کے لفظ سوا۔ ماسوا۔
اِلّا و اِلّانہ، لیکن و لیکن سے لے لئے۔ اپنے حرفوں کو گم کر دیا +

حروف نفی۔ نا اور بنا کی جگہ نہ اور نے۔ آ گئے

حرف ایجاب رہے مگر ادب کی جگہ ہیں۔ ست بچن وغیرہ کی جگہ
بجا۔ درست، واقعی۔ حق۔ بے شک۔ برحق۔ بسر و چشم۔ آ گئے
اصل زبان کے لفظ نہ رہے۔

حرف تاکید کی جگہ۔ ہرگز۔ زنہار۔ ضرور۔ البتہ۔ آ گئے۔ اصل

[۱] دیکھو سخندانِ فارس۔

لفظ گم ہو گئے

حروفِ تردید کی جگہ، یا، خواہ ہیں - اصل گم +

حروفِ تمنا میں سے کوئی حرف نہیں - کاش - فارسی کا لفظ ہے +

حروفِ ترقی میں بل تو نہیں بولتے - مگر بلکہ اپنے موقع پر آتا ہے +

اسم کی بحث میں - اسمائے اشارہ میں سے کچھ نہیں لیا - مگر از انجا کہ - باآنکہ - باانیکہ - مرکب ہو کر بہت آتے ہیں +

موصولات میں سے کچھ نہیں لیا - مگر کاف بیانیہ، اِس طرح آنے لگا، کہ بے اس کے کلام ہی بے مزہ ہو جاتا ہے - کیسا - ایسا - جیسا، کی جگہ - کس طرح وغیرہ - کس وضع وغیرہ - کتنا - اتنا - جتنا - کی جگہ - کس قدر وغیرہ بھی بولنے لگے -

یائے نسبت کی ترکیبوں میں فارسی عمومی کے بموجب نسبتی الفاظ بولنے لگے - چنانچہ دِلّی وال کی جگہ دہلوی بولتے ہیں - اِس طرح اور الفاظ ہیں - اور عورتوں میں شیخانی - سیدانی - استانی وغیرہ وغیرہ +

باوجودیکہ ہندی کے مصدر موجود تھے - مگر صدہا مصادر مرکبہ بنالئے - مثلاً ماننا - اب کہتے ہیں - ہر چند سمجھایا - اس نے منظور نہ کیا - کسی عنوان قبول نہ کیا - یعنی نہ مانا +

مُکرنا - اب کہتے ہیں - پہلے تو قبول دیا تھا پھر انکار کر گیا یعنی مُکر گیا

سوچنا - اَب کہتے ہیں ہر چند فکر کرتا ہوں عقل کام نہیں کرتی +

پچھتانا - اپنے کئے پر بہت پشیمان ہُوا - مگر اب کیا ہو سکتا

ہے یعنی پچھتایا +

اسی طرح خوش ہونا غصّے ہونا، خفا ہونا۔ تنگ ہونا۔ دِق ہونا۔ غمگین ہونا۔ تماشہ دیکھنا۔ سیر کرنی۔ انتظار کرنا۔ راہ دیکھنا۔ یہاں تک کہ بہتیرے مصدروں کی اصلی ہندی گمُ ہوگئی۔ اِس سے بڑھ کر یہ کہ عربی' فارسی کے مصدر یا مشتقات لے کر ہندی کا اشتقاق کر لیا +

گزُشتن سے گزرنا۔ اور اس کے افعال۔ محاورہ ہے۔ کہ گئی گزری بات کا اَب کیا کہنا +

فرمودن سے فرمانا۔ اور اس کے بہت سے افعال

قبول سے قبولنا محاورہ ہے۔ بڑا بادی چور تھا۔ ہرگز نہ قبولا

بدل سے بدلنا۔ اور اس کے بہت سے افعال۔ محاورہ ہے کہ اَدلے کا بَدلہ ہے صاحب +

بخشیدن سے بخشنا

لرزیدن سے لرزنا +

نواختن یا نوازش سے نوازنا

شرم سے شرمانا

کاہلی سے کہلانا۔ میاں مجبور۔ ایک قدیمی شاعر تھے۔ اُستاد مرُحوم اِن کی باتیں کیا کرتے تھے۔ کہ بڈُھے دیرینہ سال تھے۔ مکتب پڑھایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ مشاعرہ میں غزل پڑھی۔ دیکھنا۔ کس خوبصُورتی سے فعل مشتق بٹھایا ہے

باتیں دیکھ زمانہ کی، جی بات سے بھی کہلاتا ہے
خاطر سے سب یاروں کی مجبور غزل کہہ لاتا ہے

نحو میں فارسی نے کیا اثر کیا

نحو میں ترکیبِ اضافی۔ ترکیبِ توصیفی، کہیں مبتدا کہیں خبر ہو کر تمام ہندی پر چھا گئی۔ اس میں پہلا فائدہ یہ ہوا کہ اختصار کے لحاظ سے لفظوں کا پھیلاؤ کم ہو گیا +

دوسرے جمع موصوف ہو تو اسم صفت موصوف کو بھی اس کے لئے جمع لاتے تھے۔ اب واحد لاتے ہیں ؎

ملائم ہو گئیں دل پر برہ کی ساعتیں کڑیاں
پھر کٹنے لگے اُن بن نہ کٹتیں جن بنا گھڑیاں

اب گھڑی ساعتیں بولتے ہیں۔

تیسرے صیغۂ مضارع بمعنے حال۔ سودا ؎

نالہ سینے سے کرے عزمِ سفر آخرِ شب
راہ چلنے یہ باندھے ہے کمر آخرِ شب

چوتھے یہ کہ اقسام اضافہ میں تشبیہ اور استعارہ کے رنگ سے سیدھی سادی زبان رنگین ہو گئی۔ چنانچہ بھاشا میں کہنا ہو تو کہیں گے راج کنور کے دل کے کنول کی کملاہٹ دربار کے لوگوں سے نہ دیکھی گئی۔ اُردو میں کہیں گے۔ شہزادہ کے غنچۂ دل کی کملاہٹ اہلِ دربار سے نہ دیکھی گئی +

ولی وغیرہ متقدمین کے کاموں میں ایسی ترکیبیں بہت ہیں بلکہ آدھے آدھے اور سارے سارے مصرعے فارسی کے ہیں۔ مگر کچھ اور طرح سے۔ علیٰ ہٰذا القیاس بھاشا کے الفاظ اور ترکیبیں بھی زیادہ ہیں اور اس طرح ہیں کہ آج لوگوں کو فصیح نہیں معلوم ہوتیں۔ اس کی مثال ایسی ہے، گویا دُودھ میں مٹھاس ملائی، مگر وہ بھی اچھی طرح گھلی نہیں۔ ایک گھونٹ خاصا میٹھا۔ ایک بالکل پھیکا ہے۔ پھر ایک ایک میں مصری کی ڈلی دانت تلے آگئی۔ ہاں اب گھُل مِل کر وہ مرتبہ حاصل ہوا۔ جسے شیر و شکر کہتے ہیں *

نکتۂ مُنصِفانہ

بعض اشخاص یہ بھی کہتے ہیں۔ کہ خالی بھاشا میں کچھ مزہ نہیں۔ اُردو خواہ مخواہ طبیعت کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ مگر میری عقل دونوں باتوں میں حیران ہے۔ کیونکہ جب کوئی کہے آج ایک شخص آیا تھا۔ یا یہ کہیں کہ ایک منش آیا تھا۔ تو دونوں یکساں ہیں۔ کیونکر کہوں، کہ منش مخالف طبع ہے؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے۔ کہ ہم بچپن سے شخص سُنتے ہیں۔ اِس لئے ہمیں منش یا مانس۔ نامانوس معلوم ہوتا ہے۔ اِسی طرح اور الفاظ ہیں جن کی تعداد شمار سے باہر ہو گئی ہے۔

اِس سے زیادہ تعجّب یہ ہے۔ کہ بہُت سے لفظ خود متروک ہیں۔ مگر دوسرے لفظ سے ترکیب پا کر ایسے ہو جاتے ہیں۔ کہ فصحا کے

محاورہ میں جان ڈالتے ہیں۔ مثلاً یہی مانس کہ اکیلا محاورہ میں نہیں، مگر سب بولتے ہیں۔ کہ احمد ظاہر میں تو بھلا مانس معلوم ہوتا ہے باطن کی خبر نہیں۔

بندھو۔ بھاشا میں بھائی یا دوست کو کہتے ہیں۔ اب محاورہ میں بھائی بند کہتے ہیں۔ نہ فقط بندھو۔ نہ بھائی بندھو۔ اور اِن استعمالوں کی ترجیح کے لئے دلیل کسی کے پاس نہیں جو کچھ جس زمانہ میں رواج ہو گیا وہی فصیح ہو گیا۔ ایک زمانہ آئے گا۔ ہمارے محاورہ کو لوگ بے محاورہ کہہ کر ہنسیں گے۔

اگرچہ یہ بات بغیر تمثیل دیکھنے کے بھی ہر شخص کے خیال میں نقش ہے۔ کہ سنسکرت اور برج بھاشا کی مٹی سے اُردو کا پتلا بنا ہے۔ باقی اور زبانوں کے الفاظ نے خط و خال کا کام کیا ہے مگر میں چند لفظ مثالاً لکھتا ہوں۔ دیکھو سنسکرت الفاظ جب اُردو میں آئے تو اُن کی اصلیت نے انقلابِ زمانہ کے ساتھ کیونکر صورت بدلی ہے۔

سنسکرت لفظوں پر اوّل بھاشا نے پھر اُردو نے کیا کیا تصرّف کئے

(۱) چُورن۔ سنسکرت ہے یعنی آٹا۔ بھاشا میں۔ چون کہتے ہیں۔ اُردو میں چُورن پسی ہُوئی دوا کو کہتے ہیں۔ اور کٹی ہوئی چیز کے نیچے جو باریک اجزا رہ جائیں وُہ چُورا ہے +

(۲) پِشٹ - سنسکرت ہے برج بھاشا میں پِسان۔ اسی سے ہے پِسنہاری اُردو میں پِیٹھی پِیسی ہُوئی دال کے لئے خاص ہو گئی اور پِیسنا مصدر ہو گیا +

(۳) اَٹ - جسے برج بھاشا اور اُردو دونوں میں آٹا کہتے ہیں +

(۴) وارتا - یا ورت - اُردو میں بات ہو گئی +

(۵) چُہر دھر - اُردو میں چودھری ہو گیا +

(۶) چندر - چاندری - سنسکرت ہے - اُردو چاند اور چاندنی ہو گئی +

(۷) گدڑھ - گڑھ - گھر یعنی خانہ - اور کیا عجب ہے - کہ فارسی میں کدیا کدہ بھی یہی ہو +

(۸) ہست - ہاتھ ہے +

(۹) ہستی - کا ہاتھی ہو گیا +

(۱۰) بادر - سنسکرت ہے - بھاشا بادر - اردو - بادل - یعنی ابر ہو گیا +

(۱۱) دُل - ایک ایک چیز کے دو دو ٹکڑے کرنے کو کہتے ہیں - بھاشا اور اُردو میں دال خاص غلہ کے لئے اور - دَلنا مصدر نکل آیا -

(۱۲) کشیر - دُودھ - بھاشا - کھیر یا چھیر اُردو میں دُودھ چاول سے تیار ہوتی ہے +

(۱۳) دُگدھ - سنسکرت ہے - بھاشا دُودھ ہُوا - اَب اُردو میں

نو دھ کہتے ہیں۔

(۱۴) ماش - یا ماکھ - ماس - اُردو میں ٹھینا ہوگیا

عربی فارسی کے لفظ لیکر معنوں میں تصرف کرلیا اور کہیں بالعکس

(۱۵) گانڈا - اُردو میں گنّا ہوگیا - مگر گنڈیری میں ڈال باقی رہی - بہت سے الفاظ ہیں، کہ عربی، فارسی نے اُردو کو دیئے۔ اُردو نے کہیں تو لفظوں میں کچھ تصرف کیا معنی وہی رکھے کہیں لفظوں کو سلامت رکھا معنے کچھ سے کچھ کرلئے مثلاً:۔

فیلسوف - یونانی لفظ ہے - بمعنی محب الحکمت - جسے عربی میں حکیم اور انگریزی میں ڈاکٹر یا فلوزفر کہتے ہیں - مگر اُردو والے دغاباز اور مکار کو کہتے ہیں۔ اور فیلسوفی مکاری +

ابّا - امّا - اَب اور اُم سے نکلے ہیں +

خصم - عربی میں بمعنی مقابل یا دشمن ہے - مگر اُردو میں خاوند بمقابل جورو کے ہے - جس سے زیادہ کوئی دُنیا میں عزیز نہیں +

تماشا - سیر - عربی میں فقط بمعنی رفتار ہے - اُردو میں کہتے ہیں - چلو باغ کی سیر دیکھ آئیں عجب تماشا ہے -

اخلاص - عربی میں خالص کرنے کو کہتے ہیں - اُردو والے پیار - اخلاص - محبت ایک معنوں میں بولتے ہیں -

خیرات - عربی لفظ ہے یعنی نیکیاں - اُردو میں خیرات دو - صدقہ اُتارو

تکرار۔ عربی میں دوبارہ کہنے یا کام کرنے کو کہتے ہیں۔ اُردو میں نزاع یا جھگڑے کو کہتے ہیں +

طوفان۔ عربی لفظ ہے۔ فارسی میں کسی شے کی حالتِ افراط کو کہتے ہیں۔ اُردو میں بمعنے تہمت بھی آتا ہے +

خفیف۔ عربی میں ہلکی شے کو کہتے ہیں۔ ہندی میں کہتے ہیں۔ وُہ مجھ سے ذرا ملے تو سہی دیکھو کیسا خفیف کرتا ہوں یعنی شرمندہ +

مصالح۔ جمع مصلحت۔ یا ما صُلح کا مخفف ہے۔ اُردو میں گرم مصالح وغیرہ اور سامانِ عمارت کو بھی مصالح کہتے ہیں +

خاطر۔ عربی فارسی میں دل یا خیال کے موقع پر بولتے ہیں۔ اُردو میں کہتے ہیں کہ بھلا ایک گھونٹ تو ہماری خاطر سے بھی لو یا اُن کی بڑی خاطر کی۔

دستوری۔ جن معنوں میں یہاں بولتے ہیں۔ یہ یہیں کا ایجاد ہے پنجابی میں جھونگا کہتے ہیں۔

روزگار۔ فارسی میں زمانہ کو کہتے ہیں۔ ہندی میں روزگار نوکری ہے

رومال۔ جن معنوں میں یہاں بولتے ہیں یہ یہیں کا ایجاد ہے۔ فارسی میں روپاک یا دستِ پاک ہے +

خیر و صلاح۔ عوام الناس خیر سلا کہتے ہیں۔ یعنی صحت و سلامت

رَسَد۔ اگرچہ فارسی لفظ معلوم ہوتا ہے۔ مگر اہلِ فارس ان معنوں میں نہیں بولتے +

عربی فارسی کے لفظ لیکر صورت اور معنی دونوں میں تصرّف کیا

بہت سے الفاظ اس طرح لئے کہ معنوں کے ساتھ اُن کی صورت بھی بدل دی۔ اگرچہ اکثر ان میں سے عوام النّاس بولتے ہیں۔ مگر بعض الفاظ خواص کی زبانوں تک بھی پہنچ گئے۔ مثلاً

اردادہ۔ کہ اصل آردابہ تھا۔

پجادہ۔ پزادہ پزیدن سے۔

شردا۔ شوربا۔ یا شوراب۔

ٹاٹ بافی۔ تاربافی۔

کھیسا۔ کیسہ۔

زری کونا۔ زری کہنہ۔

کہگل۔ کاہ گل۔

تارزلّا۔ تار طلا یعنی زری کہنہ۔

ہمام دستہ۔ ہاون دستہ

تانے تشنے۔ طعن و تشنیع

بجاز۔ بزّاز

بک بک۔ جھک جھک۔ نق زق۔ بق بق۔

قبور۔ قربوس

توبہ تنسوہا۔ توبۃً نصوحاً

دستپناہ ۔ دست پناہ ۔ یہیں کی فارسی ہے +

تاشہ ۔ تاشہ اور تاسک ۔ فارسی لفظ ہے +

مردار سنگ ۔ مردہ سنگ

سہ بندی ۔ سپہ بندی ۔ نونگہداشت فوج

گذری ۔ گذری ۔

غرفش ۔ غُرِّش ۔

افراتفری ۔ یعنی افراط و تفریط اصل میں نہایت بہتات ، اور نہایت کمی کے معنی ہیں ۔ اب کہتے ہیں ۔ عجیب ، افراتفری پڑ رہی ہے یعنی ہل چل پڑ رہی ہے ۔

قلانچ ۔ قلاش ۔ یا قُلانچ ۔ ترکی میں دونوں ہاتھوں کے درمیان کی وسعت کو کہتے ہیں ۔ اس لئے کپڑا ماپنے کا پیمانہ ہے ۔ یہاں خرگوش یا ہرن وغیرہ جانور دوڑتے ہوں ، تو کہیں گے ، کہ قلانچیں بھرتے پھرتے ہیں ۔ ذوق سے

وحشی کو دیکھا ہم نے اُس آہو نگاہ کے
جنگل میں بھر رہا ہے قلانچیں ہرن کے ساتھ

آکا ۔ ترکی میں بڑے بھائی کو کہتے ہیں ۔ یہاں ۔ آکا ، یار دوست کو بولتے ہیں ۔ اور اس میں کچھ بانکپن کو بھی دخل ہے ۔

قیوُرق ۔ ترکی میں شئے محفوظ کو کہتے ہیں ۔ یہاں جو شے حاکم کی ضبطی میں آئے اُسے قُرق کہتے ہیں ۔

مشاطہ ۔ مُشط ۔ عربی میں کنگھی کو کہتے ہیں ۔ فارسی میں مشاطہ اُس عورت کو کہتے ہیں ۔ جو عورتوں کو بناؤ سنگار کروائے ۔ جیسے ہندوستان میں نائن ۔ اُردو میں مُشاطہ بضم اوّل ، اور تخفیف ثانی ، اُس عورت کو کہتے ہیں ۔ جو زن و مرد کی نسبت تلاش کرے ۔ اور شادی کروائے ۔

مُرغا ۔ فارسی میں مُرغ ۔ فقط پرندہ ہے ۔ اُردو میں مُرغا خروس مُرغی ۔ ماکیان کو کہتے ہیں ، اور اُن کے ہاں ہر جمعہ کو مُرغوں کی پالی بندھتی ہے

چِق ۔ باچق ۔ تُرکی میں باریک پردہ کو کہتے ہیں

کٹا ۔ تُرکی میں بڑے کو کہتے ہیں ۔ یہاں کٹا موٹے کو کہتے ہیں ۔ ہٹّا کٹّا محاورہ ہے

نظر ۔ بالتحریک ہے ۔ مگر جمع اس کی بسکون اوسط ہی بولتے ہیں ۔ وزیر ؎

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشقِ دل گیر کو
کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

خطّ ۔ مشدّد ہے ۔ مگر اب کہتے ہیں ۔ آج کل خطوں میں آداب و القاب کا دستور ہی نہیں رہا ۔ کسی اُستاد کا شعر ہے ۔ ؎

صاف تھا جب تک کہ خط تب تک جو اب صاف تھا
اَب تو خط آنے لگے شائد کہ خط آنے لگا

غم۔ بھی عربی میں مُشدّد ہے۔ فارسی اور اُردو میں بالتخفیف بولتے ہیں

طرح۔ عربی میں بالتسکین ہے۔ اُردو کے اہل محاورہ اور شاعر بھی بالتحریک باندھتے ہیں +

محل۔ بالتشدید ہے مگر کہتے ہیں۔ کل بولی بھٹیاری کے محلول پر پسند ہے +

بولی بھٹیاری۔ کوئی بوعلی بختیاری کا مُخفّف و مُبدّل کہتا ہے کوئی کہتا ہے۔ بھولی بھٹی کا +

بجے منڈل۔ بدیع منزل کا مُخفّف و مُبدّل ہے۔ دِلّی کے باہر شاہانِ قدیم کی تعمیرات سے ایک مشہور عمارت ہے۔

مِرزا احسن کو پیارے مِرزا حَسنُو کہتے ہیں۔ اور یہاں اِس کو ساکن ہی بولنا فصیح ہے۔

کلمہ۔ لام کی زیر سے ہے۔ محاورہ میں سکون لام بھی بولتے ہیں۔ اور وہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ جرأت نے کیا خوب کہا ہے ؎

کلمہ پڑھے ترا جسے دیکھے تو پھر نظر
کافر اثر ہے یہ تری کافر نگاہ کا

نشاہ۔ اہل محاورہ اِسے بھی نشا کہتے ہیں۔ ذوق نے کیا خوب کہا ہے ؎

جتنے نشے ہیں یاں۔ روشِ نشۂ شراب
ہوجاتے بدمزہ ہیں جو بڑھ جاتے حد سے ہیں

کھُلا نشے میں جو پگڑی کا پیچ اس کی میکش
سمندِ ناز کو اِک اَور تازیانہ ہُوا

انگریزی زبان بھی اپنی عملداری بڑھاتی چلی آتی ہے

انگریزی زبان بھی اپنی عملداری بڑھاتی چلی آتی ہے۔ ہندو مُسلمان بھائیوں کو اِس دن کا انتظار چاہیئے، کہ عربی فارسی کے لفظ جواب تک ہمارے تمہارے باپ دادا بولتے رہے۔ آئندہ اِن کی جگہ اِس کثرت سے انگریزی لفظ نظر آئیں گے، کہ عربی، فارسی کے لفظ خود جگہ چھوڑ کر بھاگ جائیں گے۔ چند لفظ ایسے بھی دکھانے چاہیئیں۔ جو کہ مختلف ممالک یورپ کے ہیں۔ اور اب ہماری زبان میں اِس طرح پیوند پا گئے ہیں۔ کہ جوڑ تک نہیں معلوم ہوتا مثلاً

کمرا۔ اطالی ہے۔

اسٹام۔ سٹمپ انگریزی ہے۔

نیلام۔ پرتگالی ہے۔ وہ لیلام کہتے ہیں

بسکُٹ۔ بسکٹ انگریزی ہے۔

پادری۔ زبان لاطینی سے آیا ہے۔

پنشن۔ انگریزی ہے۔

لالٹین۔ لین ٹرن انگریزی ہے۔

بوتام۔ بُوتان فرنچ ہے۔

پستول - پسٹل انگریزی ہے -

بٹن - بٹن انگریزی ہے -

فرانیل - یا فلالین - فلنیل انگریزی ہے -

بگی - انگریزی ہے -

بابنٹ - بابی نٹ - ایک جالی کی قسم کا کپڑا

گلاس - انگریزی میں عام شیشہ ہے

بوتل - باٹل انگریزی ہے -

میم - میڈم - انگریزی ہے

درجن - ڈزن انگریزی ہے -

اردلی - آرڈرلی -

اسی طرح اسٹیشن - ٹکٹ - ریل - پولیس - وغیرہ صدہا لفظ ہیں کہ خاص وعام سے بڑھ کر عورتوں کی زبان تک پہنچ گئے ہیں - اور جو الفاظ دفتروں اور کچہریوں اور صاحب لوگوں کے ملازم بولتے ہیں - اگر سب لکھے جائیں تو ایک ڈکشنری بن جائے -

اُردو نے خود بھی ایجادی تصرّف کئے

ہر زبان کے فصحا کا قاعدہ ہے - کہ اپنی زبان میں تصرّفات لطیف سے کچھ ایجاد کر کے نئے الفاظ اور اصطلاحیں پیدا کرتے ہیں - ہماری اُردو بھی اِس میدان میں کسی سے پیچھے نہیں رہی - اِن اصطلاحوں کی بنیاد

اگرچہ اتفاقی پڑتی ہے۔ مگر اُن لوگوں کی طبیعت سے ہوتی ہے۔ جو علم کے ساتھ فکرِ عالی۔ طبیعتِ برّاق۔ ذہن پُر ایجاد۔ اور ایجاد دِل پذیر رکھتے ہیں۔ انہی کے کلام کا خاص و عام کے دلوں میں بھی اثر ہوتا ہے۔ کہ اُن کی بات سب کے دلوں کو بھلی لگتی ہے۔ اور اِسے اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً :-

گھوڑے کا رنگ جسے ہندوستان میں سُرنگ اور پنجابی میں چینبا یا ککّا کہتے ہیں۔ فارسی میں اُسے کُرنگ کہتے ہیں۔ چونکہ بھاشا میں کُ۔ علامت بدی اور۔ سُ۔ علامت خُوبی ہے۔ اِس لئے اکبر نے اِس کا نام سُرنگ رکھا +

گھوڑے کی اندھیری کا نام اُجیالی رکھا کہ نیک شگون ہے۔

خاکروب کو حلال خور کا خطاب بھی اسی ذرّہ نواز بادشاہ کا بخشا ہوُا ہے۔

جہانگیر کی رنگیلی طبیعت نے شراب کا نام رام رنگی رکھا۔ اور اس کو فارسی کے شعرا نے اشعار میں بھی باندھا۔ طالب آملی ؎

مدام منکرِ صہبا و لیک میگویم ۔ کہ رام رنگیٔ ما نشئہ دگر دارد

سنگترہ کو اُس کی خوبی و خوش رنگی کے سبب سے محمد شاہ نے رنگترہ کہا۔ بُبل ہندوستان کا گلدم نام رکھا۔

ہار کے لفظ کو بدشگون سمجھ کر پھلمال کہوایا۔

شاہ عالم نے سرخاب کو بھی گلسرہ کہا۔ مگر اس نے رواج نہ پایا +

نواب سعادت علی خاں مرحوم نے ملائی کا نام بالائی رکھا۔ کہ لکھنؤ میں عام اور دلّی وغیرہ میں کم رائج ہے۔ مذاقِ سلیم دونوں کے لطف ہی امتیاز کر سکتا ہے۔

بھاشا کی ساخت کو دیکھو کہ ہر ایک زبان کے ملاپ کے لئے کیسی ملنسار طبیعت رکھتی ہے۔ نظم و نثر پر غور سے نظر کرو۔ اس نے اپنے مہمان کے لئے فقط لفظوں ہی میں جگہ خالی نہیں کی، بلکہ بہت سے الفاظ و خیالات جو کہ ملکی خصوصیّت عربی فارسی سے رکھتے تھے، وُہ بھی لے لئے۔ چنانچہ بہادری کا میدان رستم و سام کو دیا۔ حالانکہ یہاں وُہ بھیم اور ارجن کا تھا۔ سودا کہتے ہیں ؎

رستم رہا زمیں پہ نہ سام رہ گیا　　مردوں کا آسماں کے تلے نام رہ گیا

رستم سے بھلا کہہ تو سر تیغ تلے دھر دے
پیارے یہ ہمیں سے ہو ہر کارے دہر مردے

حُسن و جمال کے شبستان میں لیلےٰ و شیریں آگئیں۔ اور جب وُہ آئیں تو رانجھے کی جگہ مجنوں و فرہاد کیونکر نہ آتے۔ مجنوں و فرہاد کی آنکھوں سے گنگا۔ جمنا تو بہہ نہیں سکیں۔ مجبُور جیحوں۔ سیحوں، ہندوستان میں آگئے۔ ہمانچل اور بندھیاچل کو چھوڑ کر۔ کوہ بیستون قصرِ شیریں۔ کوہ الوند سے سر پھوڑتے ہیں۔ مگر جب کوئی خوش طبع چاہتا ہے۔ تو یہیں کے پھُولوں سے بھی یہاں کے مکان سجا دیتا ہے۔ اور وُہ عجب بہار دیتے ہیں۔

محاورات اور اصطلاحات فارسی کے ترجمے ہو گئے

ایک زبان کے محاورہ کو دوسری زبان میں ترجمہ کرنا جائز نہیں۔ مگر اِن دونوں زبانوں میں ایسا اتحاد ہو گیا کہ یہ فرق بھی اُٹھ گیا اور اپنے کارآمد خیالوں کے ادا کرنے کے لئے دلپذیر اور دلکش اور پسندیدہ محاورات جو فارسی میں دیکھے اِنہیں کبھی بجنسہٖ اور کبھی ترجمہ کر کے لیا۔ مثلاً برآمدن اور بسر آمدن ہندی میں اس کا ترجمہ لفظی ڈھونڈیں تو نہیں ہے مگر اہل زبان نے نہایت خوب صورتی کے ساتھ تضمین کر لیا۔ اور سوداؔ نے کہا۔ سوداؔ ؎

اس دل کی تفِ آہ سے کب شعلہ بر آئے بجلی کو دم سرد سے جس کے حذر آئے
افعی کو یہ طاقت ہو کہ اس سے بسر آئے وہ زلفِ سیہ اپنی اگر لہر پہ آئے

در آمدن۔ یعنی گھس آنا۔ سوداؔ ؎

یاں تک ترے دل آزارِ خلائق ہو کہ کوئی مل کر لہو منہ سے صفِ محشر میں در آئے

عرق عرق شدن۔ آب شدن۔ ذوقؔ ؎

آگ دوزخ کی بھی ہو جائے گی پانی پانی
جب یہ عاصی عرقِ شرم میں تر جائیں گے

حرف آمدن اور دل خون شدن۔ ذوقؔ ؎

حرف آئے مجھ پہ دیکھئے کس کس کے نام سے
اس درد سے عقیق کا دِل خوں یمن میں ہے

سیدانشاء - ع لب وہ کہ لعل کے بھی نگینہ پہ حرف ہے -

چشمک زدن - ذوق ؎

لب پہ ترے پسینہ کی بوند اے عقیق لب
چشمک زنی کرے ہے سہیلِ یمن کے ساتھ

پیمانہ پُر کردن - مار ڈالنا - سوداؔ ؎

ساقی چمن میں چھوڑ کے مجھ کو کدھر چلا — پیمانہ میری عمر کا ظالم تو بھر چلا

دامن افشاندہ برخاستن - بیزار ہوکر اُٹھ کھڑے ہونا - سوداؔ ؎

کیا اس چمن میں آن کے لیجائے گا کوئی — دامن تو میرے سامنے گل جھاڑ کر چلا

ازجامہ بیرون شدن - سوداؔ ؎

نکلا پڑے ہے جامہ سے کچھ اِن دنوں رقیب — تھوڑے ہی دم دلاسے میں اتنا اُبھر چلا

ذوق ؎

کب صبا آئے ترے کوچہ سے اے یار کہ میں
جوں حبابِ لب جو جامہ سے باہر نہ ہوا

فلکش خبر ندارد - یہ محاورہ بھی اہل ہند کا نہیں کیونکہ یہاں آکاس ہے . فلک ، نہیں ہے - اہل ہند اس کا مضمون کیوں باندھتے مگر سوداؔ کہتے ہیں ؎

تجھ رُخ میں ہے جو لطف ملک کو خبر نہیں
خورشید کیا ہے اِس کے فلک کو خبر نہیں

دِل از دست رفتن - بے اختیار ہو جانا - سوداؔ کا مصرع ہے ؎

ہاتھ سے جاتا رہا دل دیکھ محبوباں کی چال

دِل دادن ۔ عاشق ہونا ۔ ظفر ؎

دِل دے کے تم کو جان پہ اپنی بُری بنی
شیریں کلامی آپ کی میٹھی چھُری بنی!

میر صاحب ۔ ؎

ایسا نہ ہو دل دادہ کوئی جاں سے گزر جائے

ازجاں گزشتن ۔ جان پر کھیل جانا ۔ ظفر کا شعر ہے ۔ ؎

وہاں جائے وہی جو جان سے جائے گزر پہلے

ازسرِ چیزے گزشتن ۔ دست بردار ہونا ۔ سید انشاء ؎

خُدا کے واسطے گزرا ہیں ایسے جینے سے

ذوق علیہ الرحمۃ ؎

پہنچیں گے رہ گزرِ یار تلک کیوں کر ہم　　پہلے جب تک نہ دو عالم سے گزر جائیں گے

آصف الدولہ :- ؎

تو اپنے شیوۂ جور و جفا سے مت گزرے
تری بلا سے مرا دم رہے رہے نہ رہے

سودا ؎

چاہے تجھ چشم کے آگے جو ہو بادام سفید
کھینچ کر پوست کرے گردشِ ایام سفید

سفید شدن ، پوست کشیدن بھی فارسی کا محاورہ ہے جس کا ترجمہ

انہوں نے کر لیا ہے۔ اُردو میں کھال اُتارنا۔ ناسخ ؎

بھا گئی کون سی وہ چیز بتوں کی ہم کو
نہ کمر رکھتے ہیں ظالم نہ دہن رکھتے ہیں

یہ حقیقت میں لفظی ترجمہ فارسی محاورہ کا ہے کہ نہ کمر دارند۔ نہ دہن دارند۔ ہندی کا محاورہ بھی ہے۔ کہ نہ کمر ہے نہ دہن ہے۔

بعض جگہ اصل اصطلاح فارسی کی لے کر اس پہ اپنے شعر کی بنیاد قائم کی ہے۔ مثلاً تر دامن۔ اصطلاح فارسی میں پُر گناہ ہے۔ دیکھو اُسی کی بنیاد پر کیا مضمون پیدا کیا ہے۔ خواجہ میر درد ؎

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

ذوق ۔ ع

کہ میری تر دامنی کے آگے عرق عرق پاک دامنی ہے

چراغ سحری۔ بیمارِ جاں بلب ؎

ٹک میرِ جگر سوختہ کی جلد خبر لے کیا یار بھروسا ہے چراغِ سحری کا

اور دیکھو اُردو فارسی دو محاوروں کو کس خوبصورتی سے ترکیب دیا ہے ؎

آشیانے میں میر بلبل کے آتشِ گل سے رات پھول پڑا[1]

پنبہ دہن۔ یعنی کم گو۔ زبان دراز۔ بے ادب بُرگو۔ اُستاد مرحوم

---

[1] دلی والوں کا محاورہ ہے۔ اگر رات کو کہیں آگ لگتی تھی تو اصلی لفظوں میں تعبیر کرنا بدشگونی سمجھتے تھے کنایۃً ادا کرتے اور کہتے تھے۔ کہ دیکھنا کہیں پھول پڑا ہے۔

نے ساقی نامہ میں کہا ہے

شیشۂ مے کی یہ دراز زباں اُس پہ ہے یہ ستم کہ پنبہ دہاں

شیشہ کے منہ میں سے عرق یا شربت وغیرہ نکلتے وقت جو دھار بندھتی ہے۔ اُسے اصطلاح فارسی میں زبانِ شیشہ کہتے ہیں۔

آتش زیرِ پا۔ بیقرار۔ موئے آتش دیدہ جسے آگ کی سینک پہنچی ہو۔ ؎

بسکہ ہُوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
مُوئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

مردنِ چراغ۔ کشتنِ چراغ۔ چراغ کے بجھنے اور بجھانے کو کہتے ہیں اُسی سے شمع مردہ۔ چراغ مردہ۔ دیکھنا ذوقؔ مرحوم نے کس لطف سے جان ڈالی ہے ؎

شمعِ مُردہ کے لئے ہے دمِ عیسےٰ آتش
سوزشِ عشق سے زندہ ہوں محبت کے قتیل (از قصیدہ)

داغِ دلِ افسردہ پہ پھاہا نہیں، نہ ہو
کام اس چراغِ مُردہ کو کیا ہے کفن کے ساتھ (از غزل)

کمرِ کوہ اور دامنِ کوہ سے بھی دیکھو کیا مضمون نکالا ہے۔ ذوقؔ علیہ الرحمۃ ؎

حاضر ہیں جلو میں ترے وحشی کے ہزاروں
باندھے ہوئے کہسار بھی دامن کو کمر سے

گردن مینا۔ آتش نے کیا خوب سا مضمون نکالا ہے ؎

ہر شب شب برات ہے ہر روز روزِ عید
سوتا ہوں ہاتھ گردنِ مینا میں ڈال کے

دست سبو۔ خواجہ وزیر نے کس خوبصورتی سے اس کا ترجمہ کیا ہے ؎

ہوں وہ میکش گر نہ آیا میکدہ میں ایک دن
ہر سبو نے ہاتھ پھیلائے دعا کے واسطے

سوسن دہ زبان۔ فارسی والوں کا خیال ہے۔ میر وزیر علی صبا کہتے ہیں۔ ؎

کھولا بہار نے جو کتب خانۂ چمن سوسن نے دس ورق کا رسالہ اُٹھا لیا

سرو کو آزاد فارسی والوں نے کیا تھا۔ کہ بہار و خزاں۔ اور ثمر اور بے ثمری کی قید سے آزاد ہے۔ ذوقؔ مرحوم اس بنیاد پر فرماتے ہیں ؎

پا بزنجیر آبِ جو کی موج میں سب سرد ہیں
کیسی آزادی! کہ یاں یہ حال ہے آزاد کا

قافلۂ نکہت گل۔ سید انشاء نے کیا خوب ترجمہ کیا ؎

جو ٹھنڈے ٹھنڈے چلی ہے اے آہ، چھانو تاروں کی چل نکل تو
گلوں کی نکہت کا قافلہ بھی چمن سے ہے لاو پھاند نکلا

آسمان زمین کے قلابے ملانے بھی ایجاد اہلِ اردو کا ہے۔ ذوقؔ مرحوم ؎

قلابے آسمان و زمین کے نہ تو ملا   اس بت سے کوئی ملنے کی ناصح تباصلاح

طوفان باندھنا بھی انہی کا ایجاد ہے۔ ہندی ہیں نہ تھا ؎

اشک آئے نہیں مژگاں پہ کہ یاروں نے ابھی
پانی سونیزہ دیا باندھ کے طوفان چڑھا

بعض محاورے آئے مگر پھر متروک ہو گئے

بعض فارسی کے محاورے یا اُن کے ترجمے ایسے تھے۔ کہ میرؔ و مرزا وغیرہ اُستادوں نے لئے مگر متاخرین نے چھوڑ دیئے۔ چنانچہ فارسی کا محاورہ ہے:-

تر آمدن۔ یعنی شرمندہ شدن۔ میر صاحب کہتے ہیں ؎

کھلنے میں ترے مُنہ کی کلی پھاڑے گریبان
آگے ترے رُخسار کے گل برگ تر آوے

تو گوئی۔ میر حسن اس کا ترجمہ فرماتے ہیں۔ ع

کہے تو کہ خوشبوئیوں کے پہاڑ

ایک اور موقع پر کہتے ہیں۔ ع

کہے تو کہ دریا تھا اِک نُور کا

میر صاحب ؎

اب کوفت سے ہجراں کی جہاں دل پہ رکھا ہاتھ
جو دردِ والم تھا سو کہے تو کہ یہیں تھا

نمود کردن بمعنے ظہور کردن بھی فارسی کا محاورہ تھا ؎

نمود کر کے وہیں بحرِ غم میں بیٹھ گیا کہے تو میرؔ بھی اک بُلبلہ تھا پانی کا

حیف آنا یا حیف کسانیکہ ۔ میر صاحب ؎

حیف وے جن کے وُہ اُس وقت میں پہنچا جس وقت
اُن کنے حال اشاروں سے بتایا نہ گیا

اب اگر کہیں گے تو یہ کہیں گے کہ حیف ہے اُن لوگوں کے حال پر جن کے پاس تو گیا اور وہ بچارے اشارے سے بھی حال نہ کہہ سکے کنے ۔ ہندی ہے مگر اب متروک ہے ۔

بے تہی یعنی کم مایگی ۔ میر صاحب کا شعر ہے ؎

اس زمانہ کی تری سے لہر بحر اگتی نہیں بے تہی کرنے لگے دریا دلوں کے حوصلے

خوشم نمے آید ۔ مجھے بھلا نہیں لگتا ۔ میر صاحب فرماتے ہیں ؎

ناکامیٔ صد حسرت خوش لگتی نہیں ورنہ
اب جی سے گزر جانا کچھ کام نہیں رکھتا

خوشا بحال کسانیکہ ۔ میر صاحب فرماتے ہیں ؎

احوال خوش اُنھوں کا ہم بزم ہیں جو تیرے
افسوس ہے کہ ہم نے واں کا نہ بار پایا

داغِ ایں حسرت ام ۔ میر صاحب کہتے ہیں ؎

داغ ہوں رشکِ محبت سے کہ اتنا بیتاب
کس کی تسکین کے لئے گھر سے تو باہر نکلا

میر صاحب کہتے ہیں ؎

اے تو کہ یاں سے عاقبت کار جائیگا غافل نہ رہ کہ قافلہ یک بار جائے گا

ایک قصیدۂ مدحیہ کے مطلع ثانی میں سوداؔ کہتے ہیں ؎

اے تو کہ کارِ جنّ و بشر تجھ سے ہے رواں
تیری وُہ ذات جس سے دو عالم ہے کامراں

فارسی میں بیا امر کا صیغہ شعر کے اوّل میں لاتے ہیں اور وُہ بہت مزا دیتا ہے ؎

بیا کہ گریۂ من آں قدر زمیں نگزاشت کہ در فراقِ تو خاکے بسر تواں کردن

عُرفی ؎

بیا کہ بادلم آں مے کند پریشانی کہ غمزۂ تو نکردہ است با مسلمانی

میاں رنگین اس کا ترجمہ کرتے ہیں ؎

آ تجھ بغیر مُلکتِ دل اُجاڑ ہے چھاتی پہ رات ہجر کی کالا پہاڑ ہے

دستے دریں کار دارد۔ یعنی وُہ اِس کام میں واقفیت یا مہارت رکھتا ہے۔ سوداؔ ؎

کون ایسا ہے جسے دست ہے دل سازی میں
شیشہ ٹوٹے تو کریں لاکھ ہُنر سے پیوند

او دہنِ ایں کار ندارد۔ سودا نے کہا ؎

نہیں ہے بحث کا طوطی ترا دہن مجھ سے
سخن تو دیکھ ہے رنگین ترا چمن مجھ سے

گوش کردن ۔ سُننا ۔ سوداؔ نے ترجمہ کیا ہے

کب اس کو گوش کرے تھا جہاں ہیں اہلِ کمال
یہ سنگ ریزہ ہُوا ہے دُرِ عدن مجھ سے

بُو کردن ۔ سُونگھنا ۔ سوداؔ نے ترجمہ کیا ہے

دیکھوں نہ کبھی گُل کو ترے مُنہ کے ہی ہوتے
سنبل کے سوا زلف تری بُو نہ کروں میں

اور میرؔ صاحب نے اس سے بڑھ کر کہا ہے

گُل کو محبوب ہم قیاس کیا فرق نِکلا بہت جو باس کیا

خوابم بُرد ۔ یا خوابم در ربود ۔ یعنی مجھے نیند آگئی ۔ جرأت ہے

کل واں سے آتے ہی جو ہمیں خواب لے گیا
دیکھا تو پھر وہیں دلِ بے تاب لے گیا

ہندی کا محاورہ نیند آتی ہے ۔ خواب کا لے جانا محاورہ نہیں ۔

زنجیر کردن ۔ قید کرنا ۔ سیدؔ انشا ہے

سودا زدہ دل ہو تو یہ تدبیر کریں گے اس زلفِ گرہ گیر سے زنجیر کرینگے

خاک بر سر کردن ۔ سوداؔ نے ترجمہ کر دیا ہے

تو ہی کچھ اپنے سر پہ نہ یاں خاک کر گئی
شبنم بھی اس چمن سے صبا چشمِ تر گئی

ہندی میں ۔ سر پر خاک ڈالنی کہتے ہیں ۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ بعض رسمیں اور ٹوٹکے جو ایرانؔ اور تورانؔ

میں ہوتے تھے اُس کے اشارے اُردو میں کرنے لگے۔ سودا ؎

دوانہ ان لٹوں کا ہوں قسم ہے روحِ مجنوں کی
نہ مارو مجھ کو چوبِ گُل بغیر از بید کی چھڑیاں

میر اور سودا کے حال میں ان مطالب کی توضیح کی ہے۔[1]

داغِ جنوں۔ استاد مرحوم عالمِ طفولیت کی ایک غزل میں فرماتے ہیں ؎

دیوانہ ہوں تیرا مجھے کیا کام کہ لوں گُل
زیبائش سر کو ہے مرے داغِ جنوں گُل

اور میر صاحب مثنوی میں کہتے ہیں ؎

سرتا پا آشفتہ دماغی داغِ جنوں دے جس پہ چراغی

ولائیت میں رسم ہے، کہ قلعہ کے محاصرہ میں یا ایک لشکر سے دوسرے لشکر میں جب قاصد کا پہنچنا ممکن نہیں ہوتا تو خط کا پرزہ تیر میں باندھ کر پھینکتے ہیں۔ چنانچہ میر و سودا نے اُسے اُردو میں باندھا ہے ؎

نامہ جو واں سے آتے ہے سو تیر میں بندھا
میر کیا دیکھئے جواب اجل کے پیام کا

نہ تھا پیکاں پہ کیا جو سر جو نامہ تیر پر لکھا
سودا اشارہ قتل کا قاتل نے کس تقصیر پر لکھا

اگرچہ ان باتوں پر فصاحت کے اُصول عامّہ کے بموجب بہت

---

[1] دیکھو آبِ حیات میں میر و سودا کا حال۔

اعتراض ہوئے۔ مگر احتراز نہ ہوئے کیونکہ بولنے والوں کی نسلیں اور اصلیں اور گھر اور گھرانے فارسی سے شیر و شکر ہو رہے تھے جتنا اس کا دخل زیادہ ہوتا تھا اُتنا ہی مزہ زیادہ ہوتا تھا، اور آج دیکھتے ہیں، تو اور ہی رنگ ہے۔ ہمارے قادر الکلام انشا پرداز ترجمے کر کے انگریزی کے خیالوں کے چربے اُتارتے ہیں اور ایسا ہی چاہیئے۔ جہاں اچھا پھول دیکھا چُن لیا۔ اور دستار نہیں تو کوٹ ہی میں زیب گریبان کر لیا۔

عربی ترکیبیں ظریفانہ طور پر

ہمارے انشا پردازوں نے جب دیکھا کہ فارسی والوں نے اپنی قادر سخنی کے زور یا ظرافتِ طبع کے شور سے عربی ترکیبوں کا استعمال کیا تو اُنھوں نے بھی اپنے پیارے ملک کی زبان کو اس نمک سے بے لطف نہ چھوڑا۔ سودا فرماتے ہیں ؎

جیسے کہتا ہے کوئی ہو ترا صدفاً صفا

سیّد رضی خاں رضیؔ مرحوم نے کیا خوب کہا۔ ع

تری وہ مثل ہے کہ اے رضی نہ الی الذّی نہ الی الذّی

ہند کی تشبیہیں جاتی رہیں فارس اور عرب کی تشبیہیں اور خیالات انکی جگہ قابض ہو گئے

دونوں زبان کے بابِ تشبیہات میں ایک نکتہ کہے بغیر مجھ سے

آگے نہیں بڑھا جاتا۔ یعنی مختلف افراد انسان کے طبائع پر غور کرو، کہ ہزاروں کوس پرے پڑے ہوں۔ اور مختلف طبیعت کے ملکوں میں ہوں لیکن چونکہ طبیعت انسانی متحد ہے اس لئے دیکھو ان کے خیالات کس قدر ملتے جلتے ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بالوں کی تعریف میں ناگوں کے لہرانے اور بھونروں کے اُڑنے سے تشبیہ دیتے تھے۔ فارسی میں زلف کی تشبیہ سانپ کے ساتھ آئی ہے اس لئے اُردو میں سانپ رہے مگر بھونرے اُڑ گئے اور اس کی جگہ مُشک، بنفشہ۔ سنبل۔ ریحان آ گئے۔ جو کبھی یہاں دیکھے بھی نہیں مگر عرب کا سادہ مزاج فصیح اپنی نیچر کا حق ادا کرتا ہے اور زلف کو کوئلے سے تشبیہ دیتا ہے۔

سانولی رنگت کی تعریف میں شام برن اور میگھ برن کہتے تھے۔ اُس سے کھلتا رنگ ہوتا، تو چنپک برنی کہتے تھے اب سمن رنگ اور سیم رنگ کے الفاظ حسن کو بہار دیتے ہیں مگر چندر مکھ اور ماہِ رُخ مشترک ہے ٭

آنکھ کی تعریف میں یہاں مرگ کی آنکھ اور کنول پھول اور ممولا کی اچپلاہٹ سے تشبیہ دیتے تھے۔ اُردو میں آہو چشم رہے مگر ممولے ہوا ہو گئے۔ اور کنول کی جگہ ساغرِ لبریز اور نرگسِ شہلا آ گئی۔ جو کسی نے یہاں دیکھی بھی نہ تھی۔ بلکہ ترکِ چشم شمشیر نگاہ سے قتل کرنے لگے رفتار کے لئے بھاشا میں ہتنی اور ہنس کی چال ضرب المثل

ہے۔ اب ہنس کے ساتھ ہاتھی بھی اُڑ گیا۔ فقط کبک دری۔ شورِ محشر اور فتنۂ قیامت نے آفت برپا کر رکھی ہے

بجا شاہیں ناک کی تشبیہ طوطے کی ناک سے تھی۔ اب زنبق کی کلی سے تشبیہ دیتے ہیں۔ آتش کا شعر ہے۔ ؎

توڑنے والے گلِ زنبق کے ہیں کاٹنے والے چمن کی ناک کے

فارسی والوں نے کمر کی نزاکت میں بڑی باریکیاں نکالی ہیں۔ مگر سنسکرت نے بھی اپنی جگہ مبالغہ میں کچھ کمی نہیں کی۔ چنانچہ آنکھوں کی تعریف میں ایک شاعر نے کہا۔ گوشے ان کے کانوں سے جا ملے تھے۔ پہلے یہاں ہوا یا ابر یا ہنس کو قاصد کہتے تھے۔ انہوں نے نسیم اور صبا کو قاصد رکھا۔

بلکہ نالہ اور آہ اور اشک سے بھی پیغام رسانی کا کام لیا۔ استادِ مرحوم کا شعر ہے۔ ؎

نالہ ہے اُن سے بیاں دردِ جدائی کرتا کام قاصد کا ہے یہ تیر ہوائی کرتا

ظفر گر نہیں ہے کوئی نامہ بر تم آنسو ہی اپنا روانہ کرو

قاصد اشک آ کے خبر کر گیا قتل کوئی دل کا نگر کر گیا

فارسی والے **طفل اشک** باندھتے تھے۔ انہوں نے بھی اسے لڑکا بنایا۔ اور دیکھو استاد مرحوم نے اس کے لئے دامن کیا خوب تیار کیا ہے۔ ع

طفلِ اشک ایسا گرا دامانِ مژگاں چھوڑ کر

اور ظفر نے کہا۔ ع

کیا ہی شریر لڑکے یہ اُوپر تلے کے ہیں

اور معروف نے کہا ہے ؎

ابھی سے نامِ خدا کرنے قاصدی نکلا | یہ طفل اشک بڑا پاؤں کا بلی نکلا
بیاں کیا کروں اشک کی ابتری کا | یہ لڑکا بد اطوار پیدا ہوا ہے

فارسی عربی الفاظ ہندی میں داخل کر رہے تھے اور ہندی لفظ فارسی میں

یہ نہ سمجھنا کہ فارسی زبان ہندی میں تصرّف حاکمانہ کرتی رہی۔ نہیں اُسے بھی یہاں کے الفاظ لئے بغیر چارہ نہیں ہوا۔ چنانچہ جو الفاظ فارسی اور سنسکرت کے اصلیّت میں متفق ہیں، اُن سے قطع نظر کر کے کہتا ہوں، کہ سلاطین چغتائیہ کے دفتروں میں صدہا لفظ ہندی کے تھے۔ جو کہ فارسی عبارتوں میں بے تکلّف مستعمل ہوتے تھے۔ اور اب بھی عہد مذکور کی تواریخوں میں موجود ہیں۔

مثلاً جھروکہ درشن اور پھول کٹارہ اُور کھپوۂ مرصّع۔ جہانگیر بادشاہ اپنی توزک میں لکھتا ہے، کہ میرا بھائی شاہ مراد کوہستان فتح پور سیکری میں پیدا ہوا تھا۔ اسی واسطے میرے والد اُسے پہاڑی راجہ کہا کرتے تھے۔ اور آرام بانو بیگم میری چھوٹی بہن کو بہت پیار کرتے تھے۔ اور اکثر مجھ سے کہتے تھے۔ کہ بابا بجہتِ خاطرِ من بایں خواہرِ خود کہ لاڈلہ من است بعد از من باید بر وشے سلوک کنی کہ من یاد مے

کنم۔ نازاو برداشتہ۔ بی ادبی و شوخی ہائے اوراگبزرانی ؟۔ اسی کتاب میں معلوم ہوتا ہے۔ کہ شاہجہان بچپن میں اکبر کو شاہ باباؔ اور جہانگیر کو شاہ بھائی کہا کرتا تھا۔

اسی طرح شعرا نے اپنے تصرفاتِ رنگین کے ساتھ اشعارِ فارسی کو رونق دی ہے۔ امیر خسرو چھ سو برس پہلے کہتے ہیں۔ ع

بنشستہ چوں در پالکی نہ چرخ کہار آمدہ

قرآن السعدین میں کہتے ہیں ؎

خان کرہ چھوٹے کشورکشا　　کز لب شاہاں کرہ دارد بہا

اور دہلی کی یاد میں ایک جگہ کہتے ہیں ؎

اے دہلی داے بتانِ سادہ　　پگ بستہ و چیرہ کج نہادہ

سرآں دو چشم گردم کہ چو ہندو آنِ رہزن

ہمہ را بنوکِ مژگان زدہ برجگر کٹارہ

درچاشت گہ از شبنم گل، گرد فشانست　　آں باد کہ در ہند اگر آید جگر آید　　عرفی

سیر گشتم ز کچڑے ایام　　ہوس سیم و زر نمے دارم

پیہر از سر افراز بیش در حساب　　زچو کھنڈ لیش سایہ بر آفتاب　　ظہوری

چو کھنڈی شکوہش اگر سایہ افگند　　رفیل سپہر شانہ بدوزد بزیر بار　　اشرف

شوخ سوسن اگر دل میرباید قشقہ اَت　　ذاتِ رجپوت است ترسم ست کجہ جو کند　　طغرا

پاں خوردہ بمن دادہ اگال آں بتِ ہندی

ایں بوسہ بہ پیغام چہ رنگین مزہ دارد　　خسرو

ظہوری — شود چہرۂ زرد خورشید آل   دہندش اگر نازنیناں اگال

اور سہ نثر میں بادشاہ کے لئے کیا خوب کہا ہے

"بازجگت گردئ عالم برخود گرفت"

فارسی کے استعاروں اور تشبیہوں نے آکر کیسا زبان کا رنگ بدل دیا

بیان مذکورۂ بالا سے تمہیں اجمالاً معلوم ہوگیا ہوگا۔ کہ اُردو کا درخت اگرچہ سنسکرت اور بھاشا کی زمین میں اُگا مگر فارسی کی ہوا میں سرسبز ہوا ہے۔ البتہ مشکل یہ ہوئی، کہ بیدل اور ناصر علی کا زمانہ قریب گزر چکا تھا۔ اور اُن کے معتقد باقی تھے۔ وہ استعارہ و تشبیہ کے لُطف سے مست تھے۔ اِس واسطے گویا اُردو بھاشا میں استعارہ و تشبیہ کا رنگ بھی آیا۔ اور بہت تیزی سے آیا۔ یہ رنگ اگر اسی قدر آتا کہ جتنا چہرہ پر اُبٹنے کا رنگ یا آنکھوں میں سُرمہ۔ تو خوشنمائی اور بینائی دونوں کو مفید تھا۔ مگر افسوس کہ اُس کی شدّت نے ہماری قوّتِ بیان کی آنکھوں کو سخت نقصان پہنچایا۔ اور زبان کو خیالی باتوں سے فقط توہّمات کا سوانگ بنا دیا۔ نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ بھاشا اور اُردو میں زمین آسمان کا فرق ہوگیا۔ چاہتا ہوں، کہ دونوں کے نمونے آمنے سامنے رکھ کر اُن کے فرق دکھاؤں مگر اِس سے پہلے دو تین باتیں خیال رکھنی چاہئیں۔ اوّل تو شاعرانہ اُردو کا نوجوان جس نے فارسی کے دُودھ سے پرورش پائی۔ اُس کی طبیعت

میں بہت سے بلند خیالات اور مبالغہ مضامین کے ساتھ وہ حالات اور ملکی رسمیں اور تاریخی اشارے آگئے۔ جو فارس اور ترکستان سے خاص تعلق رکھتے تھے۔ اور بھاشا کے طبعی مخالف تھے ساتھ اس کے فارسی کی نزاکت اور لطافت طبعی کے سبب سے اُردو کے خیالات اکثر ایسے پیچیدہ ہو گئے۔ کہ بچپن سے ہمارے کانوں میں پڑتے اور ذہنوں میں جمتے چلے آتے ہیں۔ اِس لئے ہمیں مشکل نہیں معلوم ہوتے۔ اَن پڑھ۔ انجان یا غیر زبان والا اِنسان سُنتا ہے۔ تو مُنہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ کہ یہ کیا کہا، اس لئے اُردو پڑھنے والے کو واجب ہے۔ کہ فارسی کی اِنشاء پردازی سے ضرور آگہی رکھتا ہو۔

نکتۂ دقیق

فارسی اور اُردو کی انشاء پردازی میں جو دشواری ہے۔ اور ہندی کی انشاء میں آسانی ہے اِس میں ایک باریک نکتہ غور کے لائق ہے وُہ یہ ہے کہ بھاشا زبان جس شے کا بیان کرتی ہے، اُس کی کیفیت ہمیں اُن خط و خال سے سمجھاتی ہے۔ جو خاص اُسی شے کے دیکھنے سُننے، سونگھنے، چکھنے یا چھُونے سے حاصل ہوتی ہے۔ اِس بیان میں اگرچہ مبالغہ کے زور یا جوش و خروش کی دھوم دھام نہیں ہوتی مگر سُننے والے کو جو اصل شے کے دیکھنے سے مزہ آتا ہے، وُہ سُننے

سے آجاتا ہے۔ برخلاف شعرائے فارس کے کہ یہ جس شے کا ذکر کرتے ہیں۔ صاف اُسی کی بُرائی بھلائی نہیں دکھا دیتے۔ بلکہ اس کے مشابہ ایک اور شئے جسے ہم نے اپنی جگہ اچھا یا بُرا سمجھا ہُوا ہے اُس کے لوازمات کو شئے اوّل پر لگا کر ان کا بیان کرتے ہیں۔ مثلاً پھُول کہ نزاکت رنگ اور خوشبو میں معشوق سے مشابہ ہے۔ جب گرمی کی شدّت میں معشوق کے حسن کا انداز دکھانا ہے تو کہیں گے، کہ مارے گرمی کے پھُول کے رخساروں سے شبنم کا پسینہ ٹپکنے لگا۔ اور اُسی رنگ میں شاعر کہتا ہے۔ خواجہ وزیر

ع

ہوں وُہ بُلبُل جو کرے ذبح جفا تُو ہو کر
رُوح میری گلِ عارض میں رہے بُو ہو کر

تنبیہِ ضروری

یہ تشبیہیں اور استعارے اگر پاس پاس کے ہوں اور آنکھوں کے سامنے ہوں، تو کلام میں نہایت لطافت اور نزاکت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن جب دُور جا پڑیں اور بہت باریک پڑ جائیں، تو دقت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہمارے نازک خیال کسی بادشاہ کے اقبال اور عقل کے لئے اس قدر تعریف پر قناعت نہیں کرتے۔ کہ وُہ اقبال میں سکندر یونانی اور عقل میں ارسطو کا ثانی ہے۔ بلکہ

بجائے اِس کے کہتے ہیں۔ کہ اگر اس کا ہمائے عقل۔ اوجِ اقبال سے سایہ ڈالے تو ہر شخص کشورِ دانش و دولت کا سکندر اور ارسطو ہو جائے۔ بلکہ اگر اُس کے سینہ میں دلائل عقلی کا دریا جوش مارے تو طبقۂ یونان کو غرق کر دے۔ اوّل تو ہما کی یہ صفت خود ایک بے بنیاد فرض ہے۔ اور وُہ بھی اسی ملک کے ساتھ خاص ہے۔ اِس پر اقبال کا ایک فلک الافلاک تیار کرنا۔ اور اس پر نقطۂ اوج کا دریافت کرنا دیکھیئے۔ وہاں اُن کے فرضی ہُما کا جانا دیکھیئے۔ پھر زمین پر اُس خیالی آسمان کے نیچے ایک تدبیر کا یونان بسانا دیکھیئے۔ پھر اُسی فرضی ہما کی برکت کا اِس قدر عام کرنا دیکھیئے۔ جس سے دُنیا کے جاہل اس خیالی یونان میں جا کر ارسطو ہو جائیں۔

دُوسرے فقرے میں، اوّل تو علمائے ہند نے تنور سے طوفان کا نکلنا مانا ہی نہیں ہے۔ اس پر طبقۂ یونان کا اپنے فلسفہ کی تہمت میں تباہ ہونا وغیرہ وغیرہ ایسی باتیں اور روایاتیں ہیں، کہ اگرچہ ہمارے معمولی خیالات ہُوں۔ مگر غیر قوم بلکہ ہمارے بھی عام لوگ اِس سے بے خبر ہیں۔ اس لئے بے سمجھائے نہ سمجھیں گے۔ اور جب بات کو زبان سے کہہ کر سمجھانے کی نوبت آئی تو لطفِ زبان کُجا اور یہ نہیں تو تاثیر کُجا۔ مزہ وہی ہے۔ کہ آدھی بات کہی آدھی مُنہ میں ہے۔ اور سُننے والا پھڑک اُٹھا۔ تار باجا اور راگ بُوجھا۔

فارسی کے خیالات جو غیر زبان کے لوگوں کی سمجھ سے بہت دُور ہیں

اِن خیالی رنگینیوں اور فرضی لطافتوں کا نتیجہ یہ ہوُا۔ کہ جو باتیں بدیہی ہیں اور محسوسات میں عیاں ہیں۔ ہماری تشبیہوں اور استعاروں کے پیچ در پیچ خیالوں میں آکر وُہ بھی عالمِ تصوّر میں جا پڑتی ہیں۔ کیونکہ خیالات کے ادا کرنے میں ہم اوّل اشیاء بے جان کو جان دار بلکہ اکثر انسان فرض کرتے ہیں۔ بعد اُس کے جانداروں اور عاقلوں کے لئے جو باتیں مناسبِ حال ہیں، ان بے جانوں پر لگا کر ایسے ایسے خیالات پیدا کرتے ہیں۔ جو اکثر ملکِ عرب یا فارس یا ترکستان کے ساتھ قومی یا مذہبی خصوصیت رکھتے ہیں۔

شب اور شبستان کے خیالات

مثلاً رات کو اہلِ محبت کے جلسہ میں اوّل تو ساقی[1] کا آنا واجب ہے پھر معشوق بجائے ایک نازنین عورت کے پریزاد لڑکا ہو۔ اس کی پیشانی اور رخسارہ سے نورِ صبح روشن ہے۔ مگر زلف کی شام بھی برابر مشک افشاں ہے۔ صراحی کبھی سرکشی کرتی ہے۔ اِسی لئے جگر، خون ہو کر ٹپکتا ہے۔ کبھی جھکتی ہے۔ اور خندۂ قلقل سے ہنستی ہے۔

[1] ساقی عربی لفظ ہے اور ایسا ہے کہ جس کیلئے ہندی لفظ ہے ہی نہیں اِسکا سبب یہ ہے کہ اِس ملک میں ساقی اور جام کی رسم نہیں تھی اِسلئے اس کے خیالات بھی نہیں تھے۔

کبھی وہی قلقل۔ حق حق ہو کر یادِ الٰہی میں صرف ہوتی ہے۔ مگر پیالہ اپنے کھلے مُنہ سے ہنستا ہے۔ اور اُس کے آگے دامن بھی پھیلاتا ہے فلک تیرِ حوادث کا ترکش۔ اور کمان کہکشاں لگائے کھڑا ہے۔ مگر عاشق کا تیرِ آہ اِس کے سینہ کے پار جاتا ہے۔ پھر بھی زحلِ منحوس کی آنکھ نہیں پھوٹتی۔ کہ عاشق کی صبحِ مراد روشن ہو۔ یہاں کی محفل میں شمع[1] برقعِ فانوس میں تاج زر سر پر رکھے کھڑی ہے۔ اس لئے پروانہ کا آنا بھی واجب ہے۔ وُہ عاشقِ نثار آتے ہی جل کر خاک ہو جاتا ہے۔ چراغ کو ہنساتے ہیں۔ اور شمع کو عاشق کے غم میں رُلاتے ہیں گویا وُہ باوفا عاشق کے تپ میں سراپا جلتی ہے۔ اُس کی چربی گھل گھُل کر بہتی ہے۔ مگر پائے استقامت اس کا نہیں ٹلتا۔ یہاں تک کہ سفیدۂ سحری کبھی آکر کافور دیتا ہے۔ اور کبھی طبا شیر۔ شمع کا دل اس لئے بھی گداز ہے۔ کہ شبِ زندگی کا دامن بہت چھوٹا ہے۔ لیکن صبح دونوں کے ماتم میں گریبان چاک کرتی ہے۔ عاشقِ بادہ خوار کے لئے مرغِ سحر بڑا موذی ہے جو اس کے ذبح کرنے کو ہمیشہ تیغ زبان تیز رہتی ہے۔ بادِ سحر قاصدِ خجستہ گام ہے۔ کہ پیغامِ یار کا بہت جلد لاتا اور لے جاتا ہے۔ اسی عالم میں آفتاب

[1] شمع عربی میں بمعنی موم ہے۔ پھر موم بتی کو کہنے لگے۔ فارس میں آکر چربی کی بھی بننے لگی۔ مگر نام شمع ہی رہا۔ ہند میں چربی ناپاک ہے۔ اِس لئے نہ شمع تھی، نہ اس کا نام تھا۔ مُرغِ سحر کے ذبح کا مضمون بھی وہیں کا ہے۔

کبھی تو پنجۂ شعاع سے آنکھ ملتا سر برہنہ حجرۂ مشرق سے نکلتا ہے، کبھی فلک کے سبزہ گھوڑے پہ سوار کرن کا تاج زرنگار سر پر چمکاتا شفق کا پھریرا اُڑاتا آتا ہے۔ کیونکہ اپنے حریف، شاہِ انجم کی فوج کو پریشان کر کے فتح یاب آیا ہے۔

گُل و گلزار کے خیالات

اِن ہی بُنیادوں پر جب گلزار کی شگفتگی۔ یا باغ کی بہار دکھانی ہو تو ایسے خیالات ہیں دکھائیں گے کہ شاہدِ گل کے کان میں قاصدِ صبا کچھ ایسا افسوں پھونک گیا۔ کہ وُہ مارے ہنسی کے فرش سبزہ پر لوٹ گیا۔ طفلِ غنچہ مسکرا کر اپنے عاشق بلبلِ شیدا کا

دل لبھاتا ہے۔ کبھی خزاں کا غارت گر آتا ہے۔ تو اپنا اپنا جام اور غنچہ اپنی صراحی لے کر روانہ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے باغ میں بہار خود ایک معشوق ہے۔ اس کا چہرہ چمن ہے۔ گل رخسار ہیں۔ سنبل بال ہیں۔ بنفشہ زلف ہے۔ نرگس آنکھیں ہیں۔ وغیرہ وغیرہ

پھر بہار موسم جوانی ہے۔ درخت جوانانِ چمن ہیں کہ عروسانِ گلشن سے گلے مل مل کر خوش ہوتے ہیں۔ شاخیں انگڑائیاں لیتی ہیں۔ تاک کا سینہ مست پڑا اینڈتا ہے۔ اطفالِ نبات دایۂ بہار کی گود میں پرورش پاتے ہیں۔ خضر سبزہ کی برکت سے نسیم سحری مردہ ہزار سالہ میں دم عیسوی کا کام دیتی ہے۔ مگر بُلبلِ زار عشق شاہد

گُل میں اُداس ہے۔ آبِ رواں۔ عمرِ گزراں ہے۔ اُس کی موج کی تلوار سے دل کٹتے جاتے ہیں۔ سرو کے عکس کا اژدہا نگلے جاتا ہے شبنم کے آنسو جاری ہیں۔ بلبل کبھی خوش ہے۔ کہ گُل اس کا پیارا پاس ہنس رہا ہے۔ کبھی افسردہ ہے۔ کہ خزاں کا خونریزان سب کو قتل کریگا۔ یا اِن کے دشمن یعنی گلچیں و صیاد اُسے یہاں سے نکالیں گے۔ سرو یا شمشاد کے عشق میں قمری کا گیرو الباس ہے اِس کے نالہ کا آرہ دلوں کو چیرتا ہے۔ کبھی عاشق زار بھی وہیں آ نکلتا ہے۔ وہ بجائے اپنے معشوق کے حسرت، وغم سے ہمکنار رہے روتا ہے۔ اور قاصدِ صباء کو پیغام دیتا ہے۔ کہ میرے تغافل شعار کو ذرا میرے حال کی خبر کر دینا۔

مُلکی قصوں اور داستانوں کے اشارے بھی فارس ہی کے آگئے

بیان مذکورۂ بالا سے معلوم ہوا ہوگا، کہ ان میں بہت سی باتیں ایسی ہیں۔ جو خاص فارس اور ترکستان کے ملکوں سے طبعی اور ذاتی تعلق رکھتی ہیں۔ اِس کے علاوہ بعض خیالات میں اکثر اُن داستانوں یا قصوں کے اشارے بھی آگئے ہیں۔ جو خاص ملکِ فارس سے علاقہ رکھتے تھے۔ مثلاً بجائے عورت کے لڑکوں کا عشق۔ ان کے خط کی تعریف۔ شمشاد۔ نرگس۔ سنبل۔ بنفشہ۔ موئے کمر۔ قدِ سرو وغیرہ کی تشبیہیں۔ لیلیٰ۔ شیریں۔ شمع۔ گل۔ سرو وغیرہ کا حُسن۔ مجنوں۔ فرہاد۔

بلبل۔ قمری۔ پروانہ کا عشق۔ فانوس کا برقع۔ غازہ اور گلگونہ۔ مانی و بہزاد کی مصوّری۔ رستم و اسفندیار کی بہادری۔ زحل کی نحوست۔ سہیل یمن کی رنگ افشانی۔ مشاہیر فارس و یونان اور عرب کے قصّے۔ راہ ہفتخواں۔ کوہ الوند۔ کوہ بے ستون۔ جوئے شیر۔ قصر شیریں۔ جیحوں سیحوں وغیرہ وغیرہ۔ ہرچند یہ سب معاملات عرب اور فارس سے متعلق ہیں۔ مگر اُردو میں بہُت سے خیالات انہی کی بنیاد پر نظم و نثر میں پیدا ہوتے ہیں۔

تعجّب

تعجّب یہ ہے۔ کہ اِن خیالوں نے اور وہاں کی تشبیہوں نے اس قدر زور پکڑا، کہ ان کے مشابہ جو یہاں کی باتیں تھیں۔ اُنہیں بالکل مٹا دیا۔ البتہ سودا اور سید انشاء کے کلام میں کہیں کہیں ہیں۔ اور وُہ اپنے موقع پر نہایت لُطف دیتی ہیں۔

افسوس

غرض اُب ہماری انشاء پردازی ایک پُرانی یادداشت اُن تشبیہوں اور استعاروں کی ہے۔ کہ صدہا سال سے ہمارے بزرگوں کی دستمال ہوکر ہم تک میراث پہنچی ہیں۔

ہمارے متاخرین کوئی آفرین لینے کی آرزو ہوئی، تو بڑا کمال یہ

ہے۔ کہ کبھی صفت بعد صفت کبھی استعارہ در استعارہ سے اُسے اور تنگ و تاریک کیا۔ جس سے ہُوا تو یہ ہُوا۔ کہ بہت غور کے بعد فقط ایک وہمی نزاکت اور فرضی لطافت پیدا ہو گئی۔ کہ جسے محالات کا مجموعہ کہنا چاہیئے۔ لیکن افسوس یہ ہے۔ کہ بجائے اس کے کہ کلام اِن کا خاص و عام کے دلوں پر تاثیر کرے۔ وُہ مستعد لوگوں کی طبع آزمائی کے لئے ایک دقیق معمّے اور عوام کے لئے ایک عجیب گورکھ دھندا تیار ہو گیا۔ اور جواب اِن کا یہ ہے، کہ کوئی سمجھے تو سمجھے۔ جو نہ سمجھیں وُہ اپنی جہالت کے حوالے +

بھاشا کے باغ کی بہار دیکھو

اَب اس کے مقابلے میں دیکھو۔ بھاشا کا انشاء پرداز برسات میں اپنا باغ کیونکر لگاتا ہے۔ درختوں کے جھُنڈ چھائے ہیں۔ گھن کے پتے ہیں۔ اِن کی گھری گھری چھاؤں ہے۔ جامن کی ٹہنیاں، آم کے پتوں میں کھچڑی ہو رہی ہیں۔ کھرنی کی ٹہنیاں فالسے کے درخت میں پھیلی ہوئی ہیں۔ چاندنی کی بیل کمرک کے درخت پر لپٹی جاتی ہے عشق پیچہ لگرونده پہ چڑھ جاتا ہے۔ اس کی ٹہنیاں لٹکتی ہیں۔ جیسے سانپ لہرا رہے ہیں۔ پھُولوں کے گُچھے پڑے جھُوم رہے ہیں۔ میوے والے زمین کو چوم رہے ہیں۔ نیم کے پتوں کی سبزی اور پھُولوں کی سفیدی بہار پر ہے۔ آم کے مُور میں اس کے پھُولوں

کی مہک آتی ہے۔ بھینی بھینی بُو جی کو بھاتی ہے۔ جب درختوں کی ٹہنیاں ہلتی ہیں۔ مولسری کے پھولوں کا مینہ برستا ہے۔ پھل پھلاری کی بو چھاڑ ہو جاتی ہے۔ دھیمی دھیمی ہوا اُن کی بُوباس میں بسی ہوئی روشوں پر چلتی ہے۔ ٹہنیاں ایسی ہلتی ہیں جیسے کوئی جوبن کی متوالی اٹھکیلیاں کرتی چلی جاتی ہے۔ کسی ٹہنی میں بھونرے کی آواز کسی میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ الگ ہی سماں باندھ رہی ہے پرند درختوں پر بول رہے ہیں۔ اور کلول کر رہے ہیں۔ حوض میں چادر اس زور سے گرتی ہے کہ کان پڑی آواز نہیں سُنائی دیتی۔ اس سے چھوٹی چھوٹی نالیوں میں پانی لہراتا جاتا ہے۔ تو عجب بہار دیتا ہے۔ درختوں سے جانور اُترتے ہیں۔ نہاتے جاتے ہیں۔ آپس میں لڑتے جاتے ہیں۔ پروں کو پھراتے ہیں۔ اور اُڑ جاتے ہیں۔ پرند زمین پر چوکڑیاں بھرتے پھرتے ہیں۔ ایک طرف سے کوئل کی کوک۔ ایک طرف سے کوکلے کی آواز، اسی جمگھٹ میں عاشقِ مصیبت زدہ بھی کہیں اکیلا بیٹھا جی بہلا رہا ہے۔ اور اپنی جُدائی کے دُکھ کو مزے لے لے کر اُٹھاتا ہے

برکھا رُت کی بہار دیکھو

برسات کا سماں باندھتے ہیں تو کہتے ہیں۔ سامنے سے کالی گھٹا جھوم کر اُٹھی۔ ابر دھواں دھار ہے۔ بجلی کوندتی چلی آتی ہے۔ سیاہی میں سارس اور بگلوں کی سفید سفید قطاریں بہاریں دکھا رہی

ہیں۔ جب بادل کڑکتا ہے۔ اور بجلی چمکتی ہے۔ تو پرندے کبھی دبک کر ٹہنیوں میں چھپ جاتے ہیں۔ کبھی دیواروں سے لگ جاتے ہیں۔ مور جدا جھنگار تے ہیں۔ پپیہے الگ پکارتے ہیں۔ محبت کا متوالا چنبلی کے جھرمٹ میں آتا ہے۔ تو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا لہک کر پھوار بھی پڑنے لگی ہے۔ مست ہو کر وہیں بیٹھ جاتا ہے۔ اور شعر پڑھنے لگتا ہے۔

شام کا سماں دیکھو

جب ایک شہر کی خوبی بیان کرتے ہیں، تو کہتے ہیں۔ شام ہوتے ایک مقام پر پہنچا، دیکھتا ہے۔ کہ پہاڑیاں ہری بھری ہیں اردگرد سرسبز میدانوں میں بسے ہوئے گاؤں آباد ہیں۔ پہاڑ کے نیچے ایک دریا میں نرمل جل بہہ رہا ہے۔ جیسے موتی کی آب۔ بیچوں بیچ میں شہر آباد۔ جب اس کے اونچے اونچے مکانوں اور برجیوں کا عکس پڑتا ہے۔ تو پانی میں کلسیاں جگمگ، جگمگ کرتی ہیں اور دوسرا شہر آباد نظر آتا ہے۔ لبِ دریا کی پیڑیوں اور زمین کی سبزی کو برسات نے ہرا کیا ہے۔ کہ دودھیلی گایوں اور بکریوں کا چارہ ہو جائے

رات کی اداسی کا سماں دیکھو

جب اُداسی اور پریشانی کا عالم دکھاتے ہیں۔ تو کہتے ہیں۔ کہ آدھی

رات اِدھر آدھی رات اُدھر۔ جنگل سُنسان۔ اندھیر بیابان۔ مرگھٹ میں دور دُور تک راکھ کے ڈھیر۔ جلے ہوئے لکڑ پڑے ہیں۔ کہیں کہیں چتا میں آگ چمکتی ہے۔ بھُوتوں پریتوں کی ڈراؤنی صورتیں اور بھیانک مورتیں ہیں۔ کوئی تاڑ سا قد۔ لال لال دیدے پھاڑے۔ لمبے لمبے دانت نکالے گلے میں کھوپریوں کی مالا ڈالے کھڑا ہنس رہا ہے۔ کوئی ایک ہاتھی کو بغل میں مارے بھاگا جاتا ہے۔ کوئی ایک کالا ناگ لکڑی کی طرح کھڑا چبا رہا ہے۔ پیچھے غل ہوتا چلا آتا ہے۔ کہ لیجیو۔ لیجیو۔ ماریو۔ ماریو۔ جانے نہ پائے۔ دَم بھر میں یہ بھوت پریت غائب ہو جاتے ہیں۔ غل شور تھمتا ہے۔ پھر مرگھٹ کا میدان سُنسان ہے پتے ہوا سے کھڑکتے ہیں۔ ہوا کا سناٹا۔ پانی کا شور۔ اُلو کی ہوک۔ گیدڑوں کا بولنا۔ اور کتوں کا رونا۔ یہ ایسی وحشت ہے کہ پہلے ڈر بھی بھُول جاتے ہیں۔

دونوں زبانوں کی انشاپردازی کا مقابلہ

دیکھو یہ دونوں باغ آمنے سامنے لگے ہیں؟ تم نے مقابلہ کیا۔؟ دونوں کے رنگ ڈھنگ میں کیا فرق ہے؟ بھاشا کا فصیح استعارہ کی طرف بھُول کر بھی قدم نہیں رکھتا۔ جو جو لطف آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ اور جن خوش آوازیوں کو سُنتا ہے۔ یا جن خوشبوئیوں کو سونگھتا ہے۔ انھی کو اپنی میٹھی زبان سے بے تکلف، بے

مبالغہ صاف صاف کہہ دیتا ہے۔

ہندی کی انشاء پردازی بھی مبالغہ میں اپاہج نہیں

لیکن یہ نہ سمجھنا کہ ہندوستان میں مبالغہ کا زور تھا ہی نہیں۔ سنسکرت کا انشاء پرداز ذرا بگڑ جائے۔ تو زمین کے ماتھے پر پہاڑ تیوری کے بل ہو جائیں۔ اور وہاں غار پتھروں سے دانت پیسنے لگیں ان مضامین کو دیکھ کر اول ہمیں وہ عام قاعدہ یاد آتا ہے۔ کہ ہر ملک کی انشا پردازی اپنے جغرافیے اور سرزمین کی صورت حال کی تصویر بلکہ رسم ورواج اور لوگوں کی طبیعتوں کا آئینہ ہے۔ سبب اس کا یہ ہے۔ کہ جو کچھ شاعر یا انشاء پرداز کے پیش نظر ہوتا ہے۔ وہی اس کی تشبیہوں اور استعاروں کا سامان ہوتا ہے۔

(۲) معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ایران، خراسان اور توران زمین میں بہار کا موسم دلوں کو شگفتہ کرتا ہے۔ یہاں برسات کا موسم دلوں میں ذوق وشوق پیدا کرتا ہے۔ وہاں بہاریں بلبل ہزار داستان ہے۔ یہاں کوئل اور پپیہا ہے برج بھاشا کے انشاء پرداز برسات کے لطف۔ اور اس کی کیفیتیں بہت خوب دکھاتے ہیں۔ جہانگیر نے اپنے توزک میں سچ کہا ہے کہ ہندوستان کی برسات ہماری فصل بہار ہے۔ اور کوئل یہاں کی بلبل ہے۔ اس موسم میں عجب لطف سے بولتی ہے۔ اور مستیاں

کرتی ہے۔ بہار کے موسم کا کچھ لطف یہاں ہے، تو بسنت رُت کا سماں ہے۔ جس میں ہولی کے رنگ اُڑتے ہیں۔ پچکاریاں چھُٹتی ہیں۔ گلال کے قم قمے چلتے ہیں۔ وُہ باتیں نہیں جو فارسی والے بہار کے سمے پر کرتے ہیں۔

فارسی انشاء پردازی کا شکریہ

بہرحال ہمیں اپنے بزرگوں کی اس صنعت کا شکریہ ہی ادا کرنا چاہیئے۔ کہ ہندی بھاشا میں جو اضافت کی طوالت کا۔ کے۔ کی۔ سے ادا ہوتی۔ وُہ فارسی کی اضافت میں آکر مختصر ہو گئی۔ اس کے علاوہ استعارہ و تشبیہہ جو بھاشا میں شاید اس سبب سے کم لاتے تھے۔ کہ وُہ کتاب یا انشاء پردازی کی زبان نہ تھی۔ یا اس سبب سے کہ برابر کا۔ کا اور کے، کے آنے سے کلام بدمزہ ہو جاتا تھا۔ اسی طرح بہت تشبیہہ میں بھی لفظوں کے بڑھاوے سے کلام مرتبۂ فصاحت سے گر جاتا تھا۔ اب انہوں نے فارسی کو اس میں داخل کر کے استعارہ و تشبیہہ سے مرصّع کر دیا جس سے وُہ خیالوں کی نزاکت اور ترکیب کی پختگی۔ اور زورِ کلام اور تیزی و طرازی میں بھاشا سے آگے بڑھ گئی۔ اور بہت سے نئے الفاظ اور نئی ترکیبوں نے زبان میں وسعت بھی پیدا کی۔

استعاروں اور تشبیہوں کی شدّت نے ادائے مطلب اور اظہارِ اصلیّت کی طاقت کھو دی

اس فخر کے ساتھ یہ افسوس پھر بھی دل سے نہیں بھولتا، کہ انہوں نے ایک قدرتی پھول کو جو اپنی خوشبو سے مہکتا، اور اپنے رنگ سے لہکتا تھا۔ مفت ہاتھ سے پھینک دیا۔ وہ کیا ہے؟ کلام کا اثر، اور اظہارِ اصلیّت ہمارے نازک خیال اور باریک بین لوگ استعاروں اور تشبیہوں کی رنگینی اور مناسبتِ لفظی کے ذوق و شوق میں خیال سے خیال پیدا کرنے لگے۔ اور اصلی مطالب کے ادا کرنے میں بے پرواہ ہو گئے۔ انجام اس کا یہ ہوا، کہ زبان کا ڈھنگ بدل گیا۔ اور نوبت یہ ہوئی، کہ اگر کوشش کریں، تو فارسی کی طرح بہجر قعہ اور مینا بازار۔ یا فسانہ عجائب لکھ سکتے ہیں۔ لیکن ایک ملکی معاملہ یا تاریخی انقلاب اس طرح نہیں بیان کر سکتے۔ جس سے معلوم ہو جائے کہ واقعہ مذکور کیونکر ہوا۔ اور کیونکر اختتام کو پہنچا۔ اور اس کے پڑھنے والے کو ثابت ہو جائے، کہ روئداد وقت کی اور صورتِ حال معاملہ کی ایسی ہو رہی تھی۔ کہ جو کچھ ہوا اسی طرح ہو سکتا تھا۔ دوسری صورت ممکن نہ تھی۔ اور یہ تو ناممکن ہے۔ کہ ایک طرف فلسفہ یا حکمت و اخلاق کا خیال رکھیں جکی صفائی کلام لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف

لگائے۔ اور اس کے دلائل جو حُسنِ بیان کے پردہ میں برابر جلوہ دیتے جاتے ہیں۔ وُہ دلوں سے تصدیق کے اقرار لیتے جاتے ہیں۔ اور جس بات سے روکنا یا جس کام پر جھکانا منظور ہو۔ اُس میں پوری پوری اطاعت سُننے والوں سے لے سکیں۔ یہ قباحت فقط نازک خیالی نے پیدا کی۔ کہ استعارہ وتشبیہ کے انداز۔ اور مترادف فقرے، تکیہ کلام کی طرح ہماری زبان قلم پر چڑھ گئے۔ بے شک ہمارے متقدّمین اس کی رنگینی اور نزاکت کو دیکھ کر بھُولے مگر نہ سمجھے کہ یہ خیالی رنگ ہمارے اصلی جوہر کو خاک میں ملانے والا ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج انگریزی ڈھنگ پر لکھنے میں یا ان کے مضامین کے پُورا پورا ترجمہ کرنے میں ہم بُہت قاصر ہیں۔ نہیں! ہماری اصلی انشاء پردازی اس رستہ میں قاصر ہے

انشائے انگریزی کے عام اُصول

انگریزی تحریر کے عام اُصول یہ ہیں کہ جس شے کا حال یا دل کا خیال لکھئے تو اُسے اس طرح ادا کیجئے۔ کہ خُود وُہ حالت گزرنے سے یا اُس کے مشاہدہ کرنے سے جو خوشی یا غم یا غصہ یا رحم یا خوف یا جوش دل پر طاری ہوتا۔ یہ بیان وہی عالم اور وہی سماں دل پر چھا دیوے۔ بیشک ہماری طرزِ بیان اپنی چُستی بندش اور قافیوں کے مسلسل کھٹکوں سے کانوں کو اچھّی طرح خبر کرتی ہے۔ اپنے رنگین الفاظ اور

نازک مضمونوں سے خیال میں شوخی کا لطف پیدا کرتی ہے۔ ساتھ اس کے مبالغہ کلام اور عبارت کی دھوم دھام سے زمین آسماں کو تہ و بالا کر دیتی ہے۔ مگر اصل مقصد یعنی دلی اثر یا اظہار واقعیت ڈھونڈو تو ذرا نہیں چند مضمون ہیں کہ ہماری زبانوں پر بہت رواں ہیں۔ مگر حقیقت میں ہم اُن میں بھی ناکام ہیں۔ مثلاً ہم اگر کسی کے حسن کی تعریف کرتے ہیں، تو رشکِ حور اور غیرت پری پر قناعت نہ کر کے اُسے ایک پتلا ناممکنات و محالات کا بنا دیتے ہیں۔ مگر کسی حسین کا حسن خدا داد خود ایک عالم ہے۔ کہ جو کچھ آنکھوں سے دیکھ کر دلوں پر گزر جاتی ہے دل ہی جانتے ہیں۔ بس اسی کو اس طرح کیوں نہیں کہہ دیتے، کہ سُننے والے بھی کلیجہ پکڑ کر رہ جائیں۔

سجیلے جوان کا انداز

ایک بلونت جوان کی تعریف کریں گے تو رستم۔ تہمتن۔ اسفندیار، روئیں تن۔ شیر بیشۂ وغا۔ نہنگِ قلزم ہیجا۔ وغیرہ وغیرہ لکھ کر صفحے سیاہ کر دیں گے۔ لیکن اُس کی بلند گردن۔ بھرے ہوئے ڈنڑ۔ چوڑا سینہ۔ بازوؤں کی گلاوٹ۔ پتلی کمر۔ غرض خوش نما بدن اور موزوں ڈیل ڈول بھی ایک انداز رکھتا ہے۔ اس کی اپنی دلاوری اور ذاتی بہادری بھی آخر کچھ نہ کچھ ہے۔ جس کے کارناموں نے اُسے اپنے عہد میں ممتاز کر رکھا ہے۔ اسی کو ایک وضع سے کیوں نہیں

ادا کر دیتے ۔ جسے سنکر مردانہ خیالوں میں اکڑ تکڑ اور کملائے ہوئے دلوں میں اُمنگ پیدا ہو جائے۔

گلزار کی بہار

ایک چمن کی تعریف سے کبھی فلک کے سبز باغ اور گلشن انجم کے دل پر داغ دیں گے۔ کبھی اُسے فردوس بریں اور جنّات رُوئے زمین بنائیں گے۔ بلکہ ایک ایک پھول اور ایک پتے کی تعریف میں رنگ رنگ سے ورق سیاہ کریں گے۔ مگر اس کی ہریاول کا لہلہانا۔ پھولوں کا چُہچہانا۔ میٹھی میٹھی خوشبوؤں کا آنا۔ آبِ رواں کا لہرانا۔ موزوں درختوں گلزار کے تختوں کی بہار۔ ہوا کی مہک اور طوطی کی چہک۔ پپیہے کی کوک، کوئل کی ہُوک۔ جو کہ روحانی تفریح کے ساتھ انسان کے دل پر اثر کرتی ہے۔ اُس کا بیان اس طرح نہیں کرتے۔ جس کے پڑھنے سے آنکھوں میں سماں چھا جائے۔ میدانِ جنگ ہو تو زمین کے طبقوں کو اُڑا کر آسمان میں تلپٹ کر دیتے ہیں۔ اور خون کے دریا ملکوں سے ملکوں میں بہا دیتے ہیں۔ مگر اپنے موقع پر وہ تاثیر جس سے ایک بہادر کی بہادری دیکھ کر دلوں میں قوم کی ہمدردی اور رفیق پر جاں نثار کرنے کا ولولہ پیدا ہوا نہیں۔

صاحبِ علم اور علم کی خوبیاں

دوسرے کوچہ میں آکر علم کی تعریف پر اترتے ہیں۔ تو اُس کی برکت

سے، پیر، پیغمبر، ملائک، فرشتہ بنا دیتے ہیں۔ کاش اس کے عوض میں چند ظاہر کھلے کھلے فائدے بیان کر دیں۔ جس سے ہر شخص کے دل میں اس کا شوق پیدا ہو اور عالم، جاہل سمجھ جائے۔ کہ اگر بے علم رہوں گا۔ تو خواری و ذلت کی زندگی سے دین و دنیا دونوں خراب ہوں گے۔ ہماری تصنیفات میں اس کا کچھ ذکر ہی نہیں۔ اور افسوس کہ اب تک بھی ہم نے اس پر توجہ نہیں کی۔ انگریزی میں بہت خیالات اور مضامین ایسے ہیں۔ کہ ہماری زبان نہیں ادا کر سکتی۔ یعنی جو لطف ان کا انگریزی زبان میں ہے۔ وہ اردو میں پورا ادا نہیں ہو سکتا۔ جو کہ حقیقت میں زبان کی ناطاقتی کا نتیجہ ہے۔ اور یہ اہل زبان کے لئے نہایت شرم کا مقام ہے۔

ہماری انشاء پردازی کیوں ایسی بدحالی میں رہ گئی

اگر شائستہ قوموں کی انشاء پردازی سوال کرے۔ کہ اردو کی انشاء کیوں اس حالت میں مبتلا رہی؟ تو حاضر جوابی فوراً بول اٹھے گی۔ کہ قوم کی انشا پردازی بموجب اس کے حالات کے ہوتی ہے۔ اور خیالات اس کے بموجب حالات ملک اور تربیت ملکی کے ہوتے ہیں۔ جیسی ہندوستان کی تعلیم و شائستگی تھی۔ اور بادشاہوں، اور امیروں کی قدردانی تھی۔ ویسی ہی انشا پردازی رہی، اور خاتمۂ کلام اس فقرے پر ہوگا۔ کہ کوئی پرندا اپنے بازوؤں سے بڑھ کر پر نہیں

مار سکتا۔ اِس کے بانو فارسی سنسکرت، بھاشا وغیرہ تھے۔ پھر اُردو بیچاری انگلینڈ یا رُوم یا یُونان کے محلوں پر کیونکر جا بیٹھتی مگر حقیقت میں عقدہ اس سوال کا ایک اور گرہ میں بند ہے۔ وُہ یہ ہے۔ کہ ہر ایک شے کی ترقی کسی مُلک میں اُسی قدر زیادہ ہوتی ہے۔ جس قدر شئے مذکور کو سلطنت سے تعلق ہوتا ہے۔ یورپ کے ملکوں میں قدیم سے دستور ہے۔ کہ سلطنت کے اندرُونی اور بیرونی زور قوم کی ذاتی اور علمی لیاقتوں پر منحصر ہوتے تھے۔ اور سلطنت کے کل انتظام اور اس کے سب قسم کے کاروبار۔ انہی کے شمول اور انہی کی عرق ریزہ تدبیروں سے قرار پاتے تھے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اِن کی تجویزوں کی بنیاد۔ علمی اور عقلی اور تاریخی تجربہ کے زوروں پر قائم ہوتی تھی۔ پھر لیاقت مذکورہ بھی سینکڑوں ہی میں منحصر نہیں۔ بلکہ ہزاروں میں پھیلی ہُوئی تھی۔ اِس میں جہاں اور مہماتِ سلطنت ہیں۔ واں ایک یہ بھی تھا۔ کہ ہر اَمر تنقیح طلب جلسۂ عام کے اتفاق رائے سے تحریروں اور تقریروں سے حل ہوتا تھا۔ موقع پر جب ایک شخص جلسۂ عام میں استادہ ہوکر کوئی مطلب ادا کرتا تھا، تو اِدھر کی دُنیا اُدھر ہو جاتی تھی۔ پھر جب طرفِ ثانی اس کے مقابل میں جواب ترکی بہ ترکی دیتا تھا۔ تو مشرق کے آفتاب کو مغرب سے طلوع کر دیتا تھا۔ اور اَب تک بھی فقط تقریروں اور تحریروں کے زور سے ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو متفق کر کے ایک رائے سے

دوسری رائے پر پھیر لیتے ہیں۔ خیال کرنا چاہیئے۔ کہ اُن کے بیان میں کیسی طاقت اور زبان میں کیا کیا زور ہوں گے۔ برخلاف ہندوستان کے کہ یہاں کی زبان میں اگر ہوئے تو ایک بادشاہ کی خوش اقبالی میں چند شعراء کے دیوان ہوئے، جو فقط تفریح طبع اور دل لگی کا سامان ہے۔ کجا زمین کجا آسمان نہ وہ جوہر پیدا ہوا نہ کسی نے اِس کے پیدا کرنے کا ارادہ کیا۔

اُردو کی خوش اقبالی

باوجود اس کے اُردو کی خوش اقبالی اور خوش رواجی قابلِ رشک ہے۔ کیونکہ اس کی اصل تو برج بھاشا ہے۔ جو اپنی بہارِ جوانی میں بھی فقط ایک ضلع میں لین دین کی زبان تھی۔ خود اُردو دلّی سے نکلی۔ جس کا چراغ دِلّی کی بادشاہت کے ساتھ گل ہونا چاہیئے تھا پھر بھی اگر بیچوں بیچ ہندوستان میں کھڑے ہوکر آواز دیں کہ اس ملک کی زبان کیا ہے۔ تو جواب یہی سُنیں گے۔ کہ اُردو اُس کے ایک کنارے مثلاً پشاور سے چلو، تو اوّل افغانی ہے۔ اٹک اُترے تو پوٹھواری کچھ اور ہی کہتے ہیں۔ جہلم تک داہنے پر کشمیر پکار رہا ہے کہ یورولا، یورولا۔ یعنی اِدھر آؤ۔ بائیں پر ملتان کہتا ہے۔ کہ کتھے گھنیا۔ یعنی کہاں چلے۔ آگے بڑھے تو وہ بولی ہے، کہ پنجابی خاص اسی کو کہتے ہیں۔ اس کے بائیں پر پہاڑی ایسی زبان ہے، کہ

تحریر و تقریر سب اسی انگ پہ ہے۔ ستلج اتریں، تو پنجابیت کی کمی سے لوگوں کی وضع و لباس میں بھی فرق شروع ہوتا ہے۔ دِلّی پہنچے تو اور ہی سماں بندھا ہُوا ہے۔ میرٹھ سے بڑھے، تو علی گڈھ میں بھاشا سے بلا جُلا پورب کا انداز شروع ہو گیا۔ کانپور سے لکھنؤ اور الہ آباد تک یہی عالم ہے۔ جنوب کو ہٹیں، تو مارواڑی ہو کر گجراتی اور دکھنی ہو جاتی ہے۔ پھر ادھر آئے تو آگے بنگالہ ہے۔ اور کلکتہ پہنچ کر تو عالم گوناگوں خلقِ خُدا اور مُلکِ خُدا ہے۔ جس کا امتیاز حدِ انداز سے باہر ہے۔

دہلی زبانِ اُردو کے لئے ٹکسال ہے

میرے دوستو! تم جانتے ہو کہ ہر شئے کی اصلیت اور حُسن و قبح کے واسطے ایک مقام ایسا ہوتا ہے۔ جیسے سکّہ کے لئے ٹکسال کیا سبب ہے۔ کہ ابتداءہی زبان کے لئے دِلّی ٹکسال تھی؟ وجہ اِس کی یہ ہے۔ کہ دارالخلافہ تھی۔ دربار ہی میں خاندانی اُمرا اور امیرزادے خود صاحبِ علم ہوتے تھے۔ اِن کی مجلسیں اہلِ علم اور اہلِ کمال کا مجمع ہوتی تھیں۔ جن کی برکت سے طبیعتیں گویا ہر شے کے سلیقے اور شائستگی اور لطافت و ظرافت کا قالب ہوتی تھیں۔ اسی واسطے گفتگو۔ لباس۔ ادب۔ آدابِ نشست برخاست بلکہ بات بات ایسی سنجیدہ اور پسندیدہ ہوتی تھی، کہ

خواہ مخواہ سب کے دل قبول کرتے تھے۔ ہر شے کے لئے ہمیشہ نئی نئی تراش اور نئی نئی اصلاحیں اور ایجاد و اختراع وہاں سے ہوتے تھے، اور چونکہ دارالخلافہ میں شہر شہر کا آدمی موجود تھا۔ اس لئے وہ دلپسند یہ ایجاد اور اصلاحیں ہر شہر میں جلد عام ہو جاتی تھیں۔ چنانچہ بہادر شاہ سے پہلے دِلّی ہر بات کے لئے سند رہی۔ اور انہی صفتوں سے لکھنؤ نے بھی سند افتخار حاصل کی۔

اب لکھنؤ بھی اس فخر کا مالک ہے

لکھنؤ کو دیکھ کر سمجھ لو کہ دِل پسند ایجادوں اور رنگین باتوں کا ایجاد ہونا کسی شہر کے اینٹ پتھر کی تاثیر نہیں ہے۔ ہاں جہاں شائستہ اور رنگین مزاج لوگ جمع ہوں گے۔ اور دلپذیر باتوں کے سامان موجود ہوں گے۔ وہیں سے وہ پھول کھلنے لگیں گے۔ چنانچہ وہی دِلّی کے لوگ اور اُن کی اولاد تھی۔ کہ جب تباہی سلطنت اور آبادی لکھنؤ کے سبب سے وہاں پہنچے، تو چند روز میں ویسی ہی تراشیں وہاں سے نکلنے لگیں۔ لکھنؤ دارالسلطنت ہو گیا۔ اور اس کے ضمن میں زبان بھی دِلّی کی اطاعت سے آزاد ہو گئی۔ اس آزادی کی ناسخ۔ آتش۔ ضمیر۔ خلیق۔ وغیرہ اہل کمال نے بنیاد ڈالی۔ اور انیس۔ دبیر۔ رند۔ خواجہ وزیر اور سرور نے خاتمہ

کر دیا۔ اُنہوں نے زبان کو ترقی دی۔ مگر اکثر اُن میں ایسے ہُوئے۔ کہ جنگل کے صاف کرنے کو اُٹھے تھے۔ مگر اس میں دریا کا دہانہ لا ڈالا۔ یعنی صفائی زبان کی جگہ لغات کی بوچھاڑ کر دی۔ یہاں تک کہ لکھنؤ کا ورق بھی زمانہ نے اُلٹ دیا۔ اب آفتاب ہماری ملکۂ آفاق کا نشان ہے۔ جسے حکم نہیں کہ ان کی قلمرو کے خط سے باہر حرکت کر سکے۔ ڈاکوں اور ریل گاڑیوں نے پورب سے پچھم تک دوڑ کر بھانت بھانت کا جانور ایک پنجرے میں بند کر دیا۔ دِلّی برباد۔ لکھنؤ ویران دونوں کے سندی اشخاص کچھ پیوند زمین ہو گئے۔ کچھ دربدر خاک بسر اب جیسے اور شہر ویسے ہی لکھنؤ جیسے چھاؤنیوں کے بازار ویسی ہی دِلّی بلکہ اس سے بھی بدتر کوئی شہر ایسا نہیں رہا۔ جس سے لوگوں کی زبان عموماً سند کے قابل ہو۔ کیونکہ شہر میں ایسے چیدہ اور برگزیدہ اشخاص جن سے کہ وہ شہر قابل سند ہو۔ صرف گنتی کے لوگ ہوتے ہیں۔ اور وہ زمانہ کی صدہا سالہ محنتوں کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اُن میں سے بہت مر گئے۔ کوئی بڈھا جیسے خزاں کا مارا پتّا کسی درخت پر باقی ہے۔ اس بڈھے کی آواز کمیٹیوں کے غل اور اخباروں کے نقارخانوں میں سُنائی بھی نہیں دیتی۔ پس اب اگر دِلّی کی زبان کو سندی سمجھیں تو وہاں کے ہر شخص کی زبان، کیونکر سندی ہو سکتی ہے۔ ہَوا کا رُخ اور دریا کا بہاؤ نہ کسی کے اختیار میں ہے نہ کسی کو معلوم ہے۔ کہ

کدھر پھرے گا۔

ہماری زبان کا آئندہ کیا رنگ ہوگا

اِس لئے نہیں کہہ سکتے کہ اب زبان کیا رنگ بدلے گی، ہم بھی جہاز بے ناخدا ہیں۔ توکّل بخدا کر بیٹھتے ہیں۔ زمانہ کے انقلابوں کو رنگِ چمن کی تبدیلی سمجھ کر دیکھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں آزاد ؎

قسمت میں جو لکھا تھا سو دیکھا ہے اَب تلک
اور آگے دیکھئے ابھی کیا کیا ہیں دیکھتے

نظمِ اُردو کی تاریخ

فلاسفۂ یونان کہتے ہیں۔ شعر خیالی باتیں ہیں۔ جن کو واقعیّت اور اصلیّت سے تعلّق نہیں۔ قدرتی موجودات یا اس کے واقعات کو دیکھ کر جو خیالات شاعر کے دِل میں پیدا ہوتے ہیں وُہ اپنے مطلب کے موقع پر موزوں کر دیتا ہے۔ اس خیال کو سچ کی پابندی نہیں ہوتی۔ جب صبح کا نور و ظہور دیکھتا ہے۔ تو کبھی کہتا ہے۔ دیگِ مشرق سے دُود اُبلنے لگا۔ کبھی کہتا ہے۔ دریائے سیماب موج مارنے لگا۔ کوئی مشرق سے کافور اُڑاتا آتا ہے۔ صبح طباشیر بکھیرتی آتی ہے یا مثلاً سورج نکلا، اور کرن ابھی اس میں نہیں پیدا ہوئے۔ وُہ کہتا ہے۔ سنہری گیند ہوا میں اُچھالی ہے۔ صبح طلائی تھال سر پر دھرے آتی ہے۔ کبھی مرغانِ سحر کا غُل اور عالمِ نور کا جلوہ آفتاب کی چمک دمک اور شعاعوں کا خیال کر کے صبح کی دھوم دکھاتا ہے۔ اور کہتا ہے بادشاہِ مشرق سبز خنگِ فلک پر سوار۔ تاج مرصع سر پر رکھے کرن کا نیزہ لئے مشرق سے نمودار ہُوا۔ شام کو شفق کی بہار دیکھتا ہے۔ تو کہتا ہے۔ مغرب کے چھپرکھٹ

میں آرام کیا۔ ۔ اور شنگرفی چادر تان کر سو رہا۔ کبھی کہتا ہے جامِ فلک خون سے چھلک رہا ہے۔ نہیں مغرب کے ایوان میں آگ لگ گئی۔ تاروں بھری رات میں چاند کو دیکھتا ہے۔ تو کہتا ہے لاجوردی چادر میں ستارے ٹنکے ہوئے ہیں۔ دریائے نیل میں نور کا جہاز چلا جاتا ہے۔ اور روپے کی مچھلیاں تیرتی پھرتی ہیں۔ غرض ایسی ایسی باتیں ہیں کہ نہایت لطف دیتی ہیں۔ مگر اصلیّت سے انہیں کچھ بھی غرض نہیں ہے۔ باوجود اس کے صنعت گاہ عالم میں نظم ایک عجیب صنعت صنائع الٰہی سے ہے۔ اسے دیکھ کر عقل حیران ہوتی ہے۔ کہ اوّل ایک مضمون کو ایک سطر میں لکھتے ہیں۔ اور نثر میں پڑھتے ہیں۔ پھر اسی مضمون کو فقط لفظوں کے پس و پیش کے ساتھ لکھ کر دیکھتے ہیں۔ تو کچھ اور ہی عالم ہو جاتا ہے، بلکہ اس میں چند کیفیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔

۱۔ وہ وصفِ خاص ہے، کہ جسے سب موزونیّت کہتے ہیں۔

۲۔ کلام میں زور زیادہ ہو جاتا ہے۔ اور مضمون میں ایسی تیزی آ جاتی ہے۔ کہ اثر کا نشتر دل پر کھٹکتا ہے۔

۳۔ سیدھی سادی بات میں ایسا لُطف پیدا ہو جاتا ہے، کہ سب پڑھتے ہیں۔ اور مزے لیتے ہیں۔ تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب خوشی یا غم و غصّہ یا کسی کے ذوق و شوق کا خیال دل میں جوش مارتا ہے۔ اور وہ قوّتِ بیان سے ٹکر کھاتا ہے، تو زبان

سے خود بخود موزوں کلام نکلتا ہے جیسے پتھر اور لوہے کے ٹکرانے سے آگ نکلتی ہے۔ اسی واسطے شاعر وہی ہے۔ جس کی طبیعت میں یہ صنعت خدا داد ہو۔ قدرتی شاعر اگرچہ ارادہ کر کے شعر کہنے کو خاص وقت میں بیٹھتا ہے۔ مگر حقیقت میں اس کا دل، اور خیالات ہر وقت اپنے کام میں لگے رہتے ہیں۔ قدرت کے کارخانے میں جو چیز اس کے حواس میں محسوس ہوتی ہے۔ اور اس سے کچھ اثر اس کی طبیعت اُٹھاتی ہے۔ وہ ہر شخص کو نصیب نہیں۔ خواہ لطف و شگفتگی ہو۔ خواہ آزردگی۔ یا بیزاری۔ یہ ضرور ہے کہ جو کیفیت وُہ آپ اُٹھاتا ہے۔ اس کے لئے ڈھونڈھتا رہتا ہے کہ کیسے لفظ ہوں، اور کس طرح انہیں ترتیب دوں، تاکہ جو کیفیت اس کے دیکھنے سے میرے دل پر طاری ہے۔ وہی کیفیت سُننے والوں کے دل پر چھا جائے۔ اور وہ بات کہوں، کہ دل پر اثر کر جائے +

شاعر کبھی ایک حجرہ میں تنہا بیٹھتا ہے۔ کبھی سب سے الگ اکیلا پھرتا ہے۔ کبھی کسی درخت کے سایہ میں تنہا نظر آتا ہے، اور اسی میں خوش ہوتا ہے۔ وُہ کیسی ہی خستہ حالی میں ہو، مگر مزاج کا بادشاہ اور دل کا حاتم ہوتا ہے۔ بادشاہ کے پاس فوج و سپاہ دفتر و دربار اور ملک داری کے سبب کارخانے اور سامان موجود ہیں۔ اس کے پاس کچھ نہیں۔ مگر الفاظ اور معانی سے وہی سامان

بلکہ اس سے ہزاروں درجے زیادہ تیار کر کے دکھا دیتا ہے۔ بادشاہ سالہا سال میں کن کن خطرناک معرکوں سے ملک یا خزانہ جمع کرتا ہے۔ یہ جسے چاہتا ہے، گھر بیٹھے دے دیتا ہے۔ اور خود پروا نہیں۔ بادشاہ کو ایک ولایت فتح کر کے وہ خوشی حاصل نہیں ہوتی جو اُسے ایک لفظ کے ملنے سے ہوتی ہے، جو اپنی جگہ پہ موزوں سجا ہوا ہو۔ اور حق یہ ہے۔ کہ اُسے ملک کی پروا بھی نہیں۔

اس بات میں جو کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ یہ ہے کہ شیخ ابراہیم ذوق جس مکان میں بیٹھے تھے، تنگ و تاریک تھا۔ گرمی میں دل دق ہو جاتا تھا۔ بعض قدیمی احباب کبھی جاتے تو گھبراتے اور کہتے کہ مکان بدلو۔ گھڑی بھر بھی بیٹھنے کے قابل نہیں۔ تم کیونکر دن رات یہیں کاٹتے ہو؟ وہ ہُوں ہاں کرتے اور چپکے ہو رہتے کبھی مسکراتے۔ کبھی جو غزل کہتے ہوتے اُسے دیکھنے لگتے۔ کبھی اُن کا مُنہ دیکھتے۔ خدا نے مکانات، باغ، آرام و آسائش کے سامان سب دیئے تھے مگر وہ وہیں بیٹھے رہے۔ اور ایسے بیٹھے کہ مر کر اُٹھے۔ اچھا اِن کے قصائد اور غزلیں دیکھ لو۔ کسی بادشاہ کی سلطنت میں ایسے شان و شکوہ اور دھوم دھام کے سامان موجود ہیں؟ گویا سلطنت کا سامان سب انہی کا مال تھے کہ جس طرح چاہتے تھے اپنے کام میں لاتے تھے۔ جب وہ اپنے کلام کو پڑھتے تھے تو بادشاہ کو جو مالکِ سلطنت ہوتا تھا کچھ اُن سے زیادہ خوشی

نہ ہوتی ہوگی۔ کیونکہ اُسے اُن کا فکر بھی رہتا ہے۔ انہیں پروا بھی نہیں تھی۔

جس طرح کوئی زمین اپنی قابلیت کے موافق بے کچھ نہ کچھ روئیدگی کے نہیں رہ سکتی۔ اس طرح کوئی زبان اپنے اہلِ زبان کی حیثیت بموجب، نظم سے خالی نہیں رہ سکتی۔ ہر روئیدگی کی رنگینی اور شادابی اپنی سرزمین کی خاصیت ظاہر کرتی ہے۔

زبانوں کے سلسلہ میں ہر ایک نظم اپنی زبان اور اہلِ زبان کی شائستگی اور تہذیبِ علمی کے ساتھ لطافتِ طبع کے درجے دکھاتی ہے۔

نظم اُردو کی ولادت

زبان اُردو کے ظہور پر خیال کریں اور اس کی تصنیفات پر نگاہ کریں تو اس میں نثر سے پہلے نظم نظر آئے گی۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ ایک بچہ پہلے شعر کہے پھر باتیں کرنی سیکھے۔ ہاں نظم جوشِ طبع تھا۔ اس لئے پہلے نکل پڑا۔ نثر شائستگی کے بوجھ سے گراں بار تھی۔ اپنی ضرورت کے وقت ظہور کیا۔ نثر اُردو کی تصنیف، ۱۲۵۰ھ سے پہلے نظر نہیں آتی۔ البتہ نظم کی حقیقت زبانی حکایتوں اور کتابی روایتوں کی خاک چھان کر یہ نکلتی ہے، کہ جب برج بھاشا نے اپنی وسعتِ اخلاق سے عربی فارسی الفاظ کے مہمانوں کو جگہ دی

تو طبیعتوں میں اس قدرتی روئیدگی نے بھی زور کیا۔ لیکن وُہ صدہا سال تک، دوہروں کے رنگ میں ظہور کرتی رہی۔ یعنی فارسی کی بحریں اور فارسی کے خیالات نہ آتے تھے۔

امیر خسرو کے ایجاد و اختراع

امیر خسروؔ نے کہ جن کی طبیعت اختراع میں اعلیٰ درجہ صنعت و ایجاد کا رکھتی تھی۔ ملک سخن میں برج بھاشا کی ترتیب سے ایک طلسم خانہ انشا پردازی کا کھولا۔ خالق باری جس کا اختصار آج تک بچوں کا وظیفہ ہے۔ کئی بڑی بڑی جلدوں میں تھی۔ اس میں فارسی کی بحروں نے اوّل اثر کیا اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس وقت، کون کون سے الفاظ مستعمل تھے۔ جو اب متروک ہیں۔ اسکے علاوہ بہت سی پہیلیاں عجیب و غریب لطافتوں سے ادا کی ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے، کہ فارسی کے نمک نے ہندی کے ذائقہ میں کیا لطف پیدا کیا ہے، مکرنی۔ انمل۔ دو سخنے وغیرہ خاص اُنکے آئینہ کا جوہر ہے ہر ایک کی مثال لکھتا ہوں کیونکہ ان سے بھی اس وقت کی زبان کا کچھ نہ کچھ پتا لگتا ہے۔

پہیلیاں

نبولی کی پہیلی

تر ور سے اک تریا اُتری اُس نے بہت رِجھایا۔ باپ اُسکے نام جو پوچھا آدھا نام بتایا

آدھا نام پتا پر پیارا بوجھ پہیلی موری ۔ امیر خسرو یوں کہیں اپنے نام نبولی

(آئینہ کی پہیلی)

فارسی بولی آئینہ ترکی سوچی پائی نا
ہندی بولتے آرسی آئے مُنہ دیکھو جو اسے بتائے

(ناخن کی پہیلی)

بیسوں کا سر کاٹ لیا نا مارا نا خُون کیا

(لال کی پہیلی)

اندھا گونگا بہرا بولے گونگا آپ کہائے دیکھ سفیدی ہوت انگارا گونگے سے بھر جائے
بانس کا مندروا کا باشا۔ باشے کا وہ کھاجا رنگ ملے تو سر پر راکھیں داہ کو را ڈرا جا
می می کر کے نام بتایا۔ تا میں بیٹھا ایک اُلٹا سیدھا ہر پھر دیکھو وہی ایک کا ایک
بھید پہیلی میں کہی تو سُن لے میرے لال عربی، ہندی، فارسی تینوں کرد خیال

گیت عورتوں کے لئے

دِلّی بلکہ ہندوستان کے اکثر شہروں میں رسم ہے، کہ عام عورتیں برسات کی بہار میں کھم گڑھواتی ہیں۔ درخت ہو، تو اس میں جھولا ڈلواتی ہیں۔ مِل مِل کر جھولتی ہیں۔ اور گیت گا کر جی خوش کرتی ہیں۔ ان میں شاید کوئی عورت ہو جو یہ گیت نہ گاتی ہو :-

جو پیا آون کہہ گئے ابھوں نہ آئے سوامی ہو۔ اے ہو جو پیا آون کہہ گئے وغیرہ، وغیرہ، یہ گیت بھی انہی امیر خسرو کا ہے، اور برواراگ میں لے

بھی انہی کی رکھی ہوئی ہے۔ واہ کیا زبانیں تھیں، کہ جو کچھ ان سے نکل گیا۔ عام کو بھایا۔ گویا زمانے کے دل پہ نقش ہو گیا۔ بنانے والوں نے ہزاروں گیت بنائے۔ اور گانے والوں نے گائے آج ہوئے کل بھول گئے۔ چھ سو برس گذرے۔ یہ آج تک ہیں اور ہر برسات میں ویسا ہی رنگ دیئے جاتے ہیں۔ اس حسن قبول کو خدا داد نہ کہئے تو کیا کہیئے۔

بڑی بڑی عورتوں کے گانے کے لئے تو ویسے گیت تھے چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو پیا اور سوامی کی یاد میں اس طرح گانا، مناسب نہ تھا۔ لیکن دل میں اُمنگ تو وہ بھی رکھتی تھیں۔ انہیں بھی فصل کی بہار منانی تھی۔ ان کے لئے اور گیت رکھے تھے، چنانچہ ایک لڑکی گویا سسرال میں ہے۔ برسات کی رُت آئی، وہ جھولتی ہے اور ماں کی یاد میں گاتی ہے۔

اماں میرے باوا کو بھیجو جی، کہ ساون آیا	یعنی مجھے آ کر لے جائے،
بیٹی تیرا باوا تو بڈھا ری، کہ ساون آیا	یعنی وہ کیونکر آ سکتا ہے،
اماں میرے بھائی کو بھیجو جی، کہ ساون آیا	
بیٹی تیرا بھائی تو بالا ری، کہ ساون آیا	یعنی بچہ اکیلا اتنی دور کیونکر آئے
اماں میرے ماموں کو بھیجو ری، کہ ساون آیا	یعنی اس کے لئے تو وہ دُنوں عذر نہیں
بیٹی تیرا ماموں تو بانکا ری، کہ ساون آیا	بھلا وہ کب میری سُنے گا۔

ذرا غور کر کے دیکھو۔ باوجود علم و فضل اور اعلیٰ درجہ خیالات

شاعرانہ کے جب یہ لوگ پستی کی طرف جھکتے تھے، تو ایسے تہ کو پہنچتے تھے کہ زمین کی ریت تک، نکال لاتے تھے، اِن الفاظ وخیالات پر نظر کرو۔ کیسے نیچر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ عورتوں اور لڑکیوں کے فطری خیالات اور دلوں کے ارمانوں کو کیا اصلی طور سے ظاہر کرتے ہیں مکرنیوں کا انہیں موجد کہنا چاہیئے۔

مکرنیوں کے مُوجد تھے!

مکرنی-۱

سگری رین موہے سنگ جاگا		بھور بھئی تب بچھڑن لاگا
اس کے بچھڑے پھاٹت ہیّا		اے سکھی ساجن نا سکھی دیا

مکرنی-۲

سرب سلونا سب گن نیکا		وا بن سب جگ لاگے پھیکا
وا کے سر پر ہووے کون		اے سکھی ساجن نا سکھی لون

مکرنی-۳

وُہ آوے تب شادی ہووے		اِس بن دوجا اور نہ کوسے
میٹھے لاگے وا کے بول		اے سکھی ساجن نا سکھی ڈھول

ایک کنوئیں پر چار پنہاریاں پانی بھر رہی تھیں۔ امیر خسرؔو کو رستہ چلتے چلتے پیاس لگی، کوئیں پر جا کر ایک سے پانی مانگا۔ اُن میں سے ایک، اُنہیں پہنچانتی تھی۔ اِس نے اوروں سے کہا کہ دیکھو خسرؔو

یہی ہے۔ اُنہوں نے پوچھا کیا تو خسرو ہے جس کے سب گیت گاتے ہیں۔ اور پہیلیاں اور مکرنیاں انمل سُنتے ہیں۔ اُنہوں نے کہا، ہاں۔ اس پہ ایک اِن میں سے بولی کہ مجھے کھیر کی بات کہہ دے دوسری نے چرخہ کا نام لیا۔ تیسری نے ڈھول، چوتھی نے کتّے کا۔ انہوں نے کہا کہ مارے پیاس کے دَم نکلا جاتا ہے۔ پہلے پانی پلا دو۔ وُہ بولیں جب تک ہماری بات نہ کہہ دے گا۔ نہ پلائیں گے اُنھوں نے جھٹ کہا۔

انمل :۔ کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا۔ آیا کتّا کھا گیا، تو بیٹھی ڈھول بجا۔ لا پانی پلا +

اِسی طرح کبھی کبھی ڈھکوسلا کہا کرتے تھے۔ کہ وُہ بھی انہی کا ایجاد ہے :۔ ڈھکوسلا :۔

بھادوں پکی پیلی۔ چو چو پڑی کپاس۔ بی مہترانی دال پکاؤ گی۔ یا ننگا ہی سو رہوں +

دو سخنے :۔

گوشت کیوں نہ کھایا۔ ڈوم کیوں نہ گایا	گلا نہ تھا
جوتا کیوں نہ پہنا۔ سنبوسہ کیوں نہ کھایا	تلا نہ تھا
انار کیوں نہ چکھا۔ وزیر کیوں نہ رکھا	دانا نہ تھا

دو سخنے فارسی اُردو :۔

سوداگر را چہ مے باید۔ بوچے کو کیا چاہیئے	دوکان

تشنہ را چہ مے باید ۔ ملاپ کو کیا چاہیئے		چاہ
شکار بچہ مے باید کرد ۔ قوت مغز کو کیا چاہیئے		بادام

موسیقی میں ان کی طبیعت ایک بین تھی۔ کہ بن بجائے پڑی بجتی تھی۔ اس لئے دہریت کی جگہ قول و قلبانہ بنا کر بہت سے راگ ایجاد کئے۔ کہ اِن میں سے اکثر گیت اُن کے آج تک ہندوستان کے زن و مرد کی زبان پر ہیں۔ بہار راگ اور بسنت کے میلہ نے انہی کی طبیعت سے رنگ پکڑا ہے۔ بین کو مختصر کر کے ستار بھی انہی نے نکالا ہے +

لطیفہ۔ سلطان جی صاحب کے ہاں ایک سیاح فقیر مہمان آئے۔ رات کو دستر خوان پر بیٹھے۔ کھانے کے بعد باتیں شروع ہوئیں۔ سیاح نے ایسے دفتر کھولے کہ بہت رات گئی ختم ہی نہ ہوں۔ سلطان جی صاحب نے کچھ انگڑائیاں کچھ جمائیاں بھی لیں۔ وہ سادہ لوح کسی طرح بھی نہ سمجھے سلطان جی صاحب مہمان کی دل شکنی سمجھ کر کچھ نہ کہہ سکے۔ مجبور بیٹھے رہے امیر خسرو بھی موجود تھے مگر بول نہ سکتے تھے۔ کہ آدھی رات کی نوبت بجی اس وقت سلطان جی نے کہا کہ خسرو یہ کیا بجا؟ عرض کی آدھی رات کی نوبت ہے پوچھا۔ اسمیں کیا آواز آتی ہے؟ انہوں نے کہا۔ سمجھ میں تو ایسا آتا ہے :-

نان کہ خوردی خانہ برو۔ نان کہ خوردی خانہ برو۔ خانہ برو خانہ برو۔ نان کہ خوردی خانہ برو نہ کہ بدست تو کردم خانہ گرد۔ خانہ برو خانہ برو۔ حرف حرف کی حرکت سکون پر خیال کرو۔ ایک ایک چوٹ کو کیا پورا پورا ادا کر رہے ہیں۔ اور نہ کہ بدست تو کردم خانہ گرد

کو دیکھو اس نے کیا کام کیا۔

نقل۔ ایک دن کسی کوچہ سے گزر ہوا۔ دھنیا ایک دکان میں روئی دھنک رہا تھا۔ کسی نے کہا کہ جس دھنیے کو دیکھو ایک ہی انداز پر روئی دھنکتا ہے سب ایک ہی اُستاد کے شاگرد ہیں۔ کوئی بولا کہ قدرتی استاد نے سب کو ایک ہی انداز پہ سکھایا ہے آپنے کہا کہ سکھایا ہے اور ایک حرکت میں بھی تال کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ کوئی بولا کہ لفظوں میں کیونکر لاسکیں۔ فرمایا: درپئے جاناں جاں ہم رفت۔ جاں ہم رفت۔ جاں ہم۔ رفت رفت۔ جاں ہم رفت ایں ہم رفت وآں ہم رفت۔ آنہم رفت۔ آنہم رفت انیہم۔ آنہم۔ انیہم۔ آنہم رفت، رفتن۔ رفتن۔ رفتن۔ رفتن۔ دہ۔ دہ۔ رفتن دہ۔ رف رف۔ رفتن دہ۔ رفتن دہ،

نقل۔ محلہ کے سرے پر ایک بڑھیا ساقن کی دکان تھی چمّو[1] اس کا نام تھا شہر کے بیہودہ لوگ وہاں بھنگ چرس پیا کرتے تھے جب یہ دربار سے پھر کر آتے یا تفریحاً گھر سے نکلتے تو وہ بھی سلام کرتی۔ کبھی کبھی حقہ بھر کر سامنے لے کھڑی ہوتی یہ بھی اسکی دل شکنی کا خیال کر کے دو گھونٹ لے لیا کرتے۔ ایک دن اُس نے کہا کہ بلالوں۔ ہزاروں غزلیں، گیت، راگ، راگنی بناتے ہو۔ کتابیں لکھتے ہو۔ کوئی چیز لونڈی کے نام پر بھی بنا دو۔ انہوں نے کہا بی چمّو بہت اچھا کئی دن کے بعد اس نے پھر کہا کہ بھٹیاری کے لڑکے کے لئے خالق باری لکھ دی۔ ذرا لونڈی کے نام پر بھی کچھ لکھ دو گے۔ تو کیا ہو گا۔ آپ کے صدقے ہمارا نام بھی رہ جائیگا اسکے بار بار کہنے سے ایک دن خیال آگیا۔ کہا لو بی چمّو سنو[1]

[1] بکسر اوّل۔ واو مجہول۔

اوروں کی چوپہری باجے جمّو کی اٹھ پہری
باہر کا کوئی آئے ناہیں آئیں سارے شہری
معاف صوف کر آگے راکھے جنہیں ناہیں تو سل
اور جہاں سینگ سماوے جمّو کے واں موسل

یعنی یہ بادشاہوں سے بھی بڑی ہیں۔ جنگلی گنواروں کا کام نہیں۔ سفید پوش آتے ہیں۔ پیالۂ بنگ صاف مصفّا حاضر کرتی ہے۔ جس میں تس تنکا نہ ہو۔ بھنگڑ فخریہ کہا کرتے ہیں کہ وہ ایسی بھنگ پیتا ہے، کہ جس میں گاڑھے پن کے سبب سینگ کھڑی رہے ہیں۔ آپ مبالغہ کرتے ہیں کہ وُہ ایسی بھنگ بناتی ہے کہ جس میں موسل کھڑا رہے۔ خیر ان کی بدولت جمّو کا نام بھی رہ گیا۔

حق پوچھو تو جس طرح ہر جاندار کی عمر ہے۔ اسی طرح کتاب کی بھی عمر ہے۔ مثلاً شاہنامہ کو ۹ سو برس ہوئے۔ سکندر نامہ کو ۷ سو برس سمجھو، گلستان بوستان کو ۶ سو برس کہو۔ زلیخا کی عمر قریب تین سو کے ہوئی۔ مگر اب تک سب جوان ہیں اُردو میں باغ و بہار، بدرِ منیر وغیرہ جوان ہیں۔ فسانۂ عجائب جان بلب ہو گیا بہت کتابیں اوّل شہرت پاتی ہیں، پھر گمنام ہو جاتی ہیں۔ یہ گویا بچے ہی تھے، کہ مر گئے۔ بہتیری تصنیف ہوتی ہیں، اور چھپتی ہیں۔ مگر کوئی نہیں پوچھتا۔ یہ بچے مرے ہوئے پیدا ہوئے ہیں۔ بعض کتابوں کی عمریں میعادِ معلوم پر ٹھہری ہوئی ہیں۔ وہ مدارسِ سرکاری کی تصنیفیں ہیں۔ کیونکہ جب تک تعلیم میں داخل ہیں۔ تب تک

لہ بادشاہ کے ہاں اس زمانہ میں چوپہری نوبت بجا کرتی تھی *

چھپتی ہیں، اور خواہ مخواہ بکتی ہیں۔ لوگ پڑھتے ہیں۔ جب تعلیم سے خارج ہوگئیں مرگئیں۔ کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا +

ع۔ قبول خاطر و لطفِ سخن خداداد است۔ خدا یہ نعمت نصیب کرے

غرض اس جوشِ طبع اور ہنگامۂ ایجاد میں ایک، تازہ ایجاد اور ہُوا۔ جس میں ہمارے لئے تین باتیں قابلِ لحاظ ہیں۔

۱۔ مضامین عاشقانہ سے وُہ سلسلہ اشعار کا ہمارے ہاتھ آیا۔ جسے غزل کہتے ہیں، وہی قافئے یا ردیف، یا ردیف اور قافئے دونوں کی پابندی اسی طرح اصل مطلع یا کئی مطلع۔ پھر چند شعر آخیر میں مقطع اور اس میں تخلص

۲۔ عروض فارسی نے پہلا قدم ہندوستان میں رکھا

۳۔ فارسی اور بھاشا کو لُون مرچ کی طرح اس انداز سے ملایا ہے، کہ زبان پر چٹخارا دیتی ہے۔ اس میں یہ بات سب سے زیادہ قابل لحاظ ہے کہ اُنہوں نے بنیادِ عشق کی عورت ہی کی طرف سے قائم کی تھی۔ جو کہ خاصہ نظمِ ہندی کا ہے۔ مگر یہ نہیں کہہ سکتے، کہ اس تعشق کا انقلاب کس وقت ہُوا۔

غزل مذکور یہ ہے۔ ~

زحالِ مسکیں مکن تغافل۔ ورائے نیناں بنائے بتیاں

کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں۔ نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روز وصلت چو عمر کوتاہ

سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں، تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

یکایک از دل دو چشمِ جادو بصد فریبم ببرد تسکیں

کسے پڑی ہے جو جا سُناوے پیارے پی کوں ہماری بتیاں

چو شمع سوزاں چو ذرّہ حیراں ز مہرآں مہ بگشتم آخر

نہ نیند نیناں، نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجیں پتیاں

بحقِ روزِ وصالِ دلبر کہ داد ما را فریب خسرو

سپیت منکے درائے راکھوں جو جانے پاؤں پیا کے کھتیاں

ابتدائے ایجاد میں ایسا ہی ہوتا ہے زمانہ مبتدیوں کا اصلاح دینے والا ہے۔ پھر تراشیں دیکر اعلیٰ درجہ خوبی وخوش اسلوبی پر پہنچا لیتا ہے مگر اس وقت اس طرف کسی اور نے ایسی توجہ نہ کی کہ جس سے اِس طرز کا رواج جاری ہو جاتا البتہ ملک محمد جائسی نے مثنوی پدماوت کے علاوہ دوہرے اور گیت بھی لکھے۔ اور وُہ ایسے اعلیٰ رُتبہ کے ہیں۔ کہ ڈاکٹر گلگرسٹ صاحب کی تصنیف میں نہایت مدد کرتے ہیں۔ تعجّب یہ ہے۔ کہ فارسی کی بحروں میں کوئی شعر اس کا نہیں۔ دکن میں ایک سعدی گزرے ہیں۔ اُن کا فقط اِتنا حال معلوم ہے کہ اپنے تئیں ہندوستان کا سعدی شیرازی سمجھتے تھے، اور تعجب ہے کہ مرزا رفیع سوؔدا نے اپنے تذکرہ میں اُن کے اشعارِ مندرجہ ذیل کو شیخ سعدی شیرازی ہی کے نام پر لکھا ہے ہے

قشقہ چو دیدم بر رخت گفتم کہ یہ کا ویت ہے

گفتا کہ وُہ ہو باورے اِس شہر کی یہ ریت ہے

ہمنا تمہن کو دل دیا۔ تم دل لیا اور دُکھ دیا

ہم یہ کیا تم وُہ کیا۔ ایسی بھلی یہ پیت ہے

سعدی کہ گفتہ ریختہ ۔ در ریختہ ۔ دُر ریختہ
شیر و شکر ہم ریختہ ۔ ہم ریختہ ہم گیت ہے

کبیر اور تلسی داس وغیرہ کے دوہرے عالم میں زبان زد ہیں مگر وُہ فقط اتنی سند کے لئے کار آمد ہیں۔ کہ اِس عہد میں فارسی الفاظ کا دخل ہندوئل کی زبان پر بھی ہو گیا تھا۔ انہیں اس نظم سے علاقہ نہیں جو فارسی سے آکر اُردو کے قیاس میں ظاہر ہوئی، اور ملکی مالک کو بے دخل کر کے گوشہ میں بٹھا دیا۔

حامد کوئی شخص ہوئے ہیں۔ ان کا زمانہ معلوم نہیں۔ کہتے ہیں۔ کہ حامد باری انھیں کی تصنیف ہے۔ اُن کی فقط سات شعر کی ایک غزل دیکھی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید کوئی پنجابی بزرگ ہیں۔ اِس میں سے مطلع پر قناعت کرتا ہوں ؎

عزم سفر چوں کردی ساجن نینوں نیند نہ آئی جی
قدر وصلت ندانستم تم بن برہ ستائی جی

اگر یہی شعر ہیں، تو جب سے اَب تک بشمار شاعر پنجاب میں نکل آئیں گے۔ یہاں کی شاعری اب تک انہیں بیتوں میں جاری ہے لیکن یہ شاعر اور ان کی شاعری وُہ نہیں ہے جس سے ہم بحث کرتے ہیں

احمد گجراتی ہم عہد و ہم وطن ولی کے ہیں۔ وُہ فرماتے ہیں ۔

گر بیضۂ زاغے کسے در زیر سیمرغے نہد
از اصلِ خود ناید بروں آخر گلیلا ہوئے پر

گر طفلکے بازی گرے خوانندہ و عالم شود
اصلیکہ وارد کے رود آخر زنبورا ہوئے پر
گر بچۂ شیرے کسے با شیر روبہ پرورد
مردی کہ دارد کے رود آخر بگیلا ہوئے پر

سیوا ایک مصنف دکن میں گزرا ہے۔ جس نے روضۃ الشہدا کا دکنی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔ مرثیئے اس کے اُبتک وہاں کے امام باڑوں میں پڑھے جاتے ہیں۔ اور غالب ہے کہ اِس طرح کے شاعر اِن عہدوں میں بہت ہوں گے، مگر ایسی شاعری کو علمی شاعری نہیں کہہ سکتے۔+

نواز نام ایک مصنف، نے فرخ سیر کے عہد میں شکنتلا کا ترجمہ بھاشا میں لکھا۔ اُس عہد میں نظم اُردو کے ضعف، کا یہی سبب ہوگا۔ کہ جو ذی استعداد اُردو کے اہل زبان ہوتے تھے، وُہ اُردو کی شاعری کو فخر نہ سمجھتے تھے۔ کچھ کہنا ہوتا تو فارسی میں کہتے تھے البتہ عوام الناس موزوں طبع دل کی ہوس پوری کرنے کو جو مُنہ میں آتا تھا کہے جاتے تھے۔ جواہل ولایت شاعر ہوتے تھے، وہ فارسی شعر کہتے اُردو انہیں آتی نہ تھی کہتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا تمسخر کرتے ہیں۔ چنانچہ مرزا معز موسوی خاں فطرت کہ زبدۂ شعرائے ایران، اور عمدۂ شعرائے عالمگیری سے تھے اور بعد اُن کے قزلباش خاں اُمید کے متفرق اشعار دیکھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ اُس وقت ٹوٹی پھوٹی زبان تھی، اُسے پورا ادا نہ کر سکتے تھے۔

چنانچہ میر معزؔ فرماتے ہیں ؎

از زلفِ سیاہ تو بدل دوم پری ہے ۔ در خانۂ آئینہ گتا جوم پری ہے

قزلباش خاں اُمیدؔ باوجودیکہ فارسی میں بڑے نامور ہیں۔ اور اہل ہند کے ساتھ اُن کے جلسوں کی گرمجوشیاں بھی مشہور ہیں۔ مگر اُردو میں جو اظہارِ کمال کیا ہے وہ یہ ہے ؎

مالن کی بیتی آج مری انکھ ہوں پری ۔ غصّہ کیا و گالی دیا اور دگر لری

اس بات میں سب کا اتفاق ہے کہ نظمِ موجودہ نے دکن سے ظہور کیا۔ چنانچہ میر تقی میر نے بھی ایک غزل میں شاعرانہ انداز سے اشارہ کیا ہے ؎

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ، ہم ریختہ گوئی کے
معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

اور قائمؔ اُن کے ہمعصر نے صاف کہہ دیا ہے ؎

قائمؔ میں غزل طور کیا ریختہ ، ورنہ ۔ اک بات لچر سی بزبانِ دکنی تھی

بہرحال عالمگیر کے عہد میں ولیؔ نے اس نظم کا چراغ روشن کیا جو محمد شاہ کے عہد میں آسمان پر ستارہ ہو کر چمکا اور شاہ عالم کے عہد میں آفتاب[1] ہو کر اوج پر آیا ✤

نظمِ اُردو کے آغاز میں یہ امر قابلِ اظہار ہے ، کہ سنسکرت میں

---

[1] آفتاب شاہ عالم بادشاہ کا تخلص تھا۔ وُہ خود بڑا مشاق شاعر ہے۔ جس کے چار دیوان اُردو میں موجود ہیں ✤

ایک ایک لفظ کے کئی کئی معنے ہیں۔ اسی واسطے اس میں اور برج بھاشا اس کی شاخ میں ذو معنیں الفاظ اور ایہام پر دوہروں کی بنیاد ہوتی تھی فارسی میں یہ صنعت ہے مگر کم۔ اُردو میں پہلے پہلے شعر کی بنا اسی پر رکھی گئی۔ اور دَور اوّل کے شعرا میں برابر وہی قانون جاری رہا۔ اس عہد کے چند اشعار بھی نمونہ کے طور پر لکھتا ہوں ؎

لام نستعلیق کا ہے اُس بُتِ خوشخط کی زلف

ہم تو کافر ہوں اگر بندے نہ ہوں اسلام کے

کیوں نہ ہو ہم سے وہ سجن باغی | قد ہو جس کا نہال کی مانند

تو جو دریا کے پار جاتا ہے | دل مرا وار وار جاتا ہے

تم دیکھو یا نہ دیکھو ہم کو سلام کرنا | یہ تو قدیم ہی سے سر پر ہمارے کر ہے[1]

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا دیوے

کہ آخر بدنما لگتا ہے دیکھو چاند کو گہنا

صبح دکھا بانکی نہیں چھوڑیگا میرا نقد دل

آج وہ افغاں پسر آتا یہی ہو دل یہ ٹھان

نہ دیوے لے کے دل وہ جعدِ مشکیں + اگر باور نہیں تو مانگ دیکھو

---

[1] کر ہندی میں محصول کو اور سنسکرت میں ہاتھ کو کہتے ہیں۔ سر کی بالوں کی جڑوں میں جو خشکی ہو جاتی ہے۔ اُسے بھی کر کہتے ہیں +

شاہ حاتم نے بڑی کوشش کر کے اِن رنگ آمیزیوں سے اُردو کو پاک کیا۔ چنانچہ ان کے حال میں معلوم ہوگا۔

سوداؔ کے عہد میں بھی اس مادۂ فاسد کا بقیّہ چلا آتا تھا۔ چنانچہ اُنہوں نے بھی ایک قصیدہ میں اِن بزرگوں کی شکایت کی ہے۔ جس کے اشعار میں سے ایک شعر یہ ہے ؎

موتہو پرورش شانہ تو پھر ہے موسل
رام پور کی ہو کٹاری تو کہیں سیتا پھل

مگر لطف یہ ہے، کہ خود بھی موقع پاتے تھے، تو کہیں نہ کہیں کہہ جاتے تھے، چنانچہ فرمایا ہے ؎

حکّاک کا پسر بھی مسیحا سے کم نہیں
فیروزہ ہووے مردہ تو دیتا ہے وہ جلا

اگرچہ وُہ انداز پہلے کی نسبت بالکل نہیں رہے پھر بھی جس قدر ہیں وُہ ایسے زبان پر چڑھے ہُوئے ہیں کہ جن مضامین کے ادا کرنے کی ہمیں آج کل ضرورت پڑتی ہے۔ اِس کے لئے خلل انداز ہوتے ہیں یہ بات بھی بھُولنی نہ چاہئے کہ جس طرح ایک نوجوان مُرغ اپنے پَر جھاڑ کر نئے پَر نکالتا ہے۔ اِسی طرح ہماری زبان بھی اپنے الفاظ کو بدلتی چلی آتی ہے۔ چنانچہ بہت سے الفاظ ہیں۔ جن کا دَور بدور شعرا کے کلام میں اشارہ کیا گیا ہے +

یہ اظہار قابلِ افسوس ہے کہ ہماری شاعری چند معمولی مطالب

کے پھندوں میں پھنس گئی ہے۔ یعنی مضامین عاشقانہ۔ مے خواریِ مستانہ بے گل و گلزار۔ وہمی رنگ و بُو پیدا کرنا۔ ہجر کی مصیبت کا رونا۔ وصلِ موہوم پر خوش ہونا۔ دُنیا سے بیزاری۔ اسی میں فلک کی جفا کاری اور غضب یہ ہے۔ کہ اگر کوئی اصلی ماجرا بیان کرنا چاہتے ہیں، تو بھی خیال استعاروں میں ادا کرتے ہیں۔ نتیجہ جس کا یہ ہے کہ کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔ میرے دوستو! دیکھتا ہوں۔ کہ علوم و فنون کا عجائب خانہ کھلا ہے۔ اور ہر قوم اپنے اپنے فن انشاء کی دستکاریاں بھی سجائے ہوئے ہے کیا نظر نہیں آتا۔ ہماری زبان کس درجہ پر کھڑی ہے؟ ہاں صاف نظر آتا ہے کہ پا انداز میں پڑی ہے۔

ہمارے بزرگوں میں سے دلّی میں اوّل مرزا رفیع سوداؔ۔ پھر شیخ ابراہیم ذوقؔ نے زبان کی پاکیزگی۔ الفاظ کی شستگی اور ترکیب کی چُستی سے کلام میں خوب زور پیدا کیا۔ میر تقی میرؔ اور خواجہ میر دردؔ نے زارنالی۔ افسردہ دلی۔ دُنیا سے بیزاری کے مضامین کو خوب ادا کیا ہے غالبؔ نے بعض مواقع پر ان کی عمدہ پیروی کی۔ مگر معنے آفرینی کے عاشق تھے اور زیادہ توجّہ اُن کی فارسی پر رہی۔ اس لئے اردو میں غالباً صاف اشعار کی تعداد سو دو سو شعر سے آگے نہ نکلی جرأتؔ نے عاشق و معشوق کے معاملات اور دونوں کے دلی خیالات کو نہایت خوبی اور شوخی سے بیان کیا۔ مومن خاںؔ نے باوجود مشکل پسندی کے پیروی کی لکھنؤ میں شیخ امام بخش ناسخؔ اور خواجہ حیدر علی آتشؔ نے اردو،

صبا، وزیر وغیرہ نے شاعری کا حق ادا کیا۔ مگر پھر خیال کرو، کہ فقط زبانی طوطا مینا بنانے سے حاصل کیا؟ جو شاعری ہمارا ہر قسم کا مطلب اور ہمارے دل کا ہر ایک ارمان پورا نہ نکال سکے۔ گویا ایک ٹوٹا قلم ہے جس سے پورا حرف نہ نکل سکے۔ دارالخلافہ دہلی جو کہ انشاء اور شاعری اُردو کے لئے دارالضرب تھا۔ وہاں ذوقؔ اور غالبؔ نے رسمی شاعری پر خاتمہ کیا۔ لکھنؤ میں ناسخؔ و آتشؔ سے شروع ہو کر رندؔ۔ وزیرؔ صباؔ تک سلسلہ جاری رہا۔ ایک زمانہ میں مثل مشہور تھی، کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو۔ اور بگڑا گویا مرثیہ خواں، لیکن لکھنؤ میں ان دونوں شاخوں کے صاحب کمال بھی ایسے ہوئے کہ صدیوں کو رونق دے دی۔ اسی اعتبار سے کہہ سکتے ہیں۔ کہ میر انیس اور میر زا دبیر خاتمہ شعرائے اُردو کا ہیں۔ اور چونکہ اس فن کے صاحب کمال کا پیدا ہونا نہایت درجہ کی آسودگی اور زمانہ کی قدردانی اور متعدد سامانوں پر منحصر ہے۔ اور اب زمانہ کا رنگ، اس کے بالکل برخلاف ہے۔ اس لئے ہندوستان کو اس شاعری کی ترقی اور ایسے شعرا کے پیدا ہونے سے بالکل مایوس ہو جانا چاہیئے۔ البتہ کوئی نیا فیشن نکلے، پھر اس میں خدا جانے کیا کیا کمال ہوں اور کون کون اہل کمال ہوں +

خاتمہ کلام میں عقل کے نجومی سے سوال ہوا کہ اس شاعری کا ستارہ جو نحوست زوال میں آگیا ہے۔ کبھی اوج اقبال پر بھی طلوع کرے گا، یا نہیں؟ جواب ملا کہ نہیں۔ پوچھا گیا کہ سبب؟ جواب ملا کہ حکام وقت

کی یہ زبان نہیں۔ نہ اُن کے کار آمد ہے۔ اِسی لئیے وہ اِس کے قدردان نہیں۔ نہ وہ اُسے جانتے ہیں۔ نہ اِس کے جاننے کو کچھ فخر جانتے ہیں وہاں سے ہمارے شعرا کو جھوٹے خوشامدی کا خطاب مِلا ہُوا ہے اچھا یا قسمت یا نصیب! جن لوگوں کے کلام ہماری زبان کے لئیے سند سمجھے جاتے تھے۔ اُنکی تو یہ عزت ہوئی۔ اب اس نیم جان مُردہ کے رونے والے چند بڈھے رہے ہیں۔ جن کی دردناک آوازیں کبھی کبھی آہِ سرد کے ہمرا میں بلند ہو کر سینوں میں رہ جاتی ہیں۔ کبھی وہ دِل آسودہ ہوتے ہیں تو ایک مشاعرہ کر کے مِل بیٹھتے ہیں۔ اور آپس ہی میں ایک دُوسرے کی تعریفیں کر کے جی خوش کر لیتے ہیں۔ شاعر غریب اپنے بزرگوں کی قبریں قائم رکھنے کو اتنی ہی تعریف پر قناعت کر لیں۔ مگر پیٹ کو کیا کریں؟ یہ دوزخ تو بہت سی تعریف سے بھی نہیں بھرتا +

پھر سوال ہُوا کہ کوئی ایسی تدبیر ہے۔ جس سے اس کے دن بھی پھریں۔ اور پھر ہماری نظم کا باغ لہلہاتا نظر آئے؟ جواب مِلا کہ ہاں' ہمت و تدبیر کو خُدا نے بڑی برکت دی ہے۔ صورت یہی ہے کہ ایشیا میں ایسے کمالوں کی رونق حکام کی توجہ سے ہوتی ہے۔ شاعروں کو چاہئیے کہ اُسے حاکموں کے کارآمد یا اِن کی پسند کے قابل بنائیں۔ ایسا کریں گے، تو شعر کہنے والوں کو کچھ فائدہ ہوگا۔ اور جس قدر فائدہ ہوگا۔ اُسی قدر چرچا زیادہ ہوگا۔ اسی قدر ذہن اور

فکر و جودت کریں گے، اور دلچسپ ایجاد اور خوش نما اختراع نکالیں گے، اسی کو ترقی کہتے ہیں۔

یہ تو تم نے دیکھ لیا، کہ اُردو میں جو سرمایہ انشاء پردازی کا ہے۔ فارسی کی بدولت ہے۔ قدمائے فارس ہر قسم کے مضامین سے لُطف اُٹھاتے تھے۔ متاخرین فقط غزل میں منحصر ہو گئے ذی استعداد قصیدے بھی کہتے رہے۔ اُردو والوں نے بھی آسان کام سمجھ کر اور عوام پسندی کو غرض ٹھہرا کر حُسن و عشق وغیرہ کے مضامین کو لیا۔ اور اس میں کچھ شک نہیں، کہ جو کچھ کیا۔ بہت خوب کیا۔ لیکن وُہ مضمون اس قدر مستعمل ہو گئے کہ سُنتے سنتے کان تھک گئے ہیں وہی مقرری باتیں ہیں۔ کہیں ہم لفظوں کو پس و پیش کرتے ہیں کہیں الٹ بدل کرتے ہیں۔ اور کہے جاتے ہیں۔ گویا کھائے ہُوئے بلکہ اوروں کے چبائے ہُوئے نوالے ہیں۔ اِنھیں کو چباتے ہیں، اور خوش ہوتے ہیں۔ خیال کرو۔ اِس میں کیا مزا رہا۔ حُسن و عشق سبحان اللہ بہت خوب۔ لیکن تابہ کے؟ حُور ہو یا پری گلے کا ہار ہو جائے تو اجیرن ہو جاتی ہے۔ حسن و عشق سے کہاں تک جی نہ گھبرائے اور اب تو وُہ بھی سو برس کی بڑھیا ہو گئی +

ایک دشواری یہ بھی ہے۔ کہ اِن خیالات کے ادا کرنے کے لئے ہمارے بزرگ الفاظ و معنی اور استعاروں اور تشبیہوں کے ذخیرے تیار کر گئے ہیں۔ اور وہ اس قدر رواں ہو

گئے ہیں کہ ہر شخص تھوڑے فکر سے کچھ نہ کچھ کرلیتا ہے ۔ اگر اور خیال نظم کرنا چاہے، تو ویسا سامان نہیں۔ البتہ ذی استعداد مشاق چاہیں، تو کر بھی سکتے ہیں ۔ لیکن کم بخت حسن و عشق کے مضمون ۔ اس کے خط و خال اور بہار گلزار کے الفاظ اُن کی زبان و دہان میں رچے ہوئے ہیں ۔

اگر کچھ کہنا چاہیں، تو اوّل اُسے بھلائیں ۔ پھر اس کے مناسب، مقام ویسے ہی نرالے استعارے ۔ اور نئی تشبیہیں ۔ انوکھی ترکیبیں اور لفظوں کی عمدہ تراشیں پیدا کریں ۔ اور یہ بڑی عرق ریزی اور جاں کا ہی کا کام ہے ۔

بے ہمتی جو ہماری قوم پر حاکم اور با اختیار بنی ہوئی ہے ۔ اُسے اس سے زیادہ روکنے کا موقعہ کیا مل سکتا ہے ۔ اس اتفاقی معاملہ نے اور تو جو کیا سو کیا ۔ بڑی قباحت یہ پیدا کی کہ ارباب زمانہ نے متفق اللفظ کہہ دیا ۔ کہ اُردو نظم مضامین عاشقانہ ہی کہہ سکتی ہے ۔ اسے ہر ایک مضمون کے ادا کرنے کی طاقت اور لیاقت بالکل نہیں، اور یہ ایک بڑا داغ ہے جو ہماری قومی زبان کے دامن پر لگا ہے ۔ سوچتا ہوں ۔ کہ اُسے کون دھوئے ۔ اور کیونکر دھوئے ہاں یہ کام ہمارے نوجوانوں کا ہے ۔ جو کشورِ علم میں مشرقی اور مغربی دونوں دریاؤں کے کناروں پر قابض ہو گئے ہیں ۔

ان کی ہمت، آبیاری کرے گی۔ دونوں کناروں سے پانی لائے
گی۔ اور اس داغ کو دھوئے گی۔ بلکہ قوم کے دامن کو موتیوں
سے بھر دے گی ٭

(آغا محمد باقر نے استقلال پریس لاہور سے چھپوا کر لاہور سے شائع کی)

اچھی کتابیں۔ جو آپ کے ذوق مطالعہ کی آئینہ دار ہیں

آبِ حیات ———— محمد حسین آزاد
تاریخ اردو ادب ———— رام بابو سکسینہ
اردو شاعری کا مزاج ———— ڈاکٹر وزیر آغا
اردو کی کہانی ———— ڈاکٹر سہیل بخاری
نظمِ آزاد ———— آزاد/ تبسم کاشمیری
مقدمہ آبِ حیات ———— 〃
نگارستانِ پارس ———— محمد حسین آزاد
بیانِ غالب ———— آغا محمد باقر
ادب اور کلچر ———— ڈاکٹر سلیم اختر
شاگردانِ مصحفی ———— ڈاکٹر تبسم کاشمیری
اردو میں قومی شاعری ———— سید مظفر عباس
تنقیدی دبستان ———— ڈاکٹر سلیم اختر
ادب اور لاشعور ———— 〃
افسانہ۔ حقیقت سے علامت تک ———— 〃
اردو ادب میں طنز و مزاح ———— ڈاکٹر وزیر آغا
شامِ دوستاں آباد ———— 〃
آخری یادگار مشاعرہ ———— فرحت اللہ بیگ

غالب کی تہذیبی شخصیت ———— جیلانی کامران
جوہر اور اس کی شاعری ———— محمود عاصم
حسرت اور اس کی شاعری ———— 〃
پھر وہی بیان اپنا ———— اخلاق احمد دہلوی
یادوں کے گلاب ———— اے حمید
گفتگو ———— قتیل شفائی
چھتنار ———— 〃
آوازوں کے سائے ———— 〃
نذرِ بتاں ———— جاں نثار اختر
سلاسل ———— 〃
سکوتِ شب ———— 〃
گھر آنگن ———— 〃
چاکِ گریباں ————
آواز کا سفر ————
چادرِ صحرا ————
گلیاں دھوپ دروازے ————
نقشِ آب ————

مکتبۂ عالیہ ———— ایبک روڈ (انار کلی) لاہور